

چاند نگر

ابن انشاء

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بو جھل ہو تو پھر نیند کہاں کی

چاندنگر

ابن انشا

چاندنگر

عاکف بک ڈپو

۲۳۷. منیا محل دہلی. ۶.

ISBN 81- 8188 - 063 - 3

نام کتاب	:	چاند نگر
مصنف	:	ابن انشاء
سن اشاعت	:	۲۰۰۹ء
قیمت	:	120 روپے
مطبوعہ	:	ایچ۔ ایس۔ آف سیٹ پریس، نئی دہلی۔ ۲
پبلشر	:	عاکف بک ڈپو
		۳۲۴۳، کوچہ تارا چند، دریا گنج نئی دہلی۔ ۲

CHAND NAGAR

IBN E INSHA

PRICE RS. 120/-

YEAR 2009

PRINTED AT H.S. OFFSET PRESS NEW DELHI - 2

AAKIF BOOK DEPOT

3243, Kucha Tarachand, Darya Ganj, New Delhi-2

Ph: 011-23257189 Fax: 91-11-23265480

www.aakif.com

E-mail : sales@aakif.com

ترتیب

مختصر نظمیں

- ۱۵ چاند کے منائی
- ۲۰ اے متوالو! ناقوں والو!!
- ۲۳ یہ سرائے ہے
- ۲۶ کاکمک کا چاند
- ۲۹ اے مرے سوچ نگر کی رانی
- ۳۲ غم رائیگاں
- ۳۶ ایسی راتیں بھی کتنی گزری ہیں
- ۳۸ لوگ پوچھیں گے
- ۴۰ سائے سے
- ۴۲ انتظار کی رات
- ۴۴ وہ دریچے
- ۴۶ اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

۵۴	انشانے پھر عشق کیا
۵۸	فرد گزاشت
۶۰	اداس رات کے آنکھ میں
۶۴	واپسی
۶۶	صبا کا ایک جھونکا
۶۹	ڈھلتی رات
۷۲	پھلے پھر کے سناٹے میں
۷۷	خزاں کی ایک شام
۷۹	چل سو چل
۸۱	سہرائے

رنجیت

(غزلیات)

۸۶	دل سی چیز کے گاہک ہوں گے
۸۷	لوگ ہلاں شام سے بڑھ کر
۸۸	ہم رات بہت روئے
۹۱	اور تو کوئی بس نہ چلے گا
۹۳	پیت کے روگی سب کچھ بوجھ
۹۴	خوب ہمارا ساتھ نبھایا
۹۵	اُن کا دعویٰ، اُن کی عدالت
۹۶	ساوَن بھاؤں ساٹھ ہی دن ہیں

- ۹۷ ہم اُن سے اگر بل بیٹھتے ہیں
- ۹۸ زمین پہ سبزہ لہک رہا ہے
- ۱۰۰ سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے
- ۱۰۲ یوں تو ہے وحشتِ جزوِ طبیعت
- ۱۰۳ ہم جنگل کے جوگی
- ۱۰۴ ہمیں تم پہ گمانِ وحشت تھا
- ۱۰۵ جنگل جنگل شوق سے گھومو
- ۱۰۶ دل کس کے تصور میں
- ۱۰۷ دل کا تھا چاک لگر
- ۱۰۸ پیت کرنا تو ہم سے نبھانا سجن
- ۱۰۹ کبھی ان کے ملن کی آسانے

طویل نظمیں

- ۱۱۳ بغداد کی ایک رات
- ۱۲۰ شنگھائی
- ۱۵۲ مضامینات
- ۱۶۳ امن کا آخری دن
- ۱۷۴ اقتصاد
- ۱۸۳ کوچے کی لڑائی
- ۱۸۷ کوریا کی خبریں

دیباچہ طبع اول

ایڈ گراہمن پو کی ایک نظم ہے — ایڈوریڈو یعنی شہرِ تمنا — قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک بہادر جی دارنٹ اوپچی بنا، دھوپ اور سائے سے بے پروا ایڈوریڈو کی تلاش میں مستانِ گیت گاتا گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا ہے لیکن برسوں گزر گئے۔ زندگی کی شام آگئی۔ اسے روتے زمین پر کوئی خطہ ایسا نہ ملا جو اس کے خوابوں کے شہر کا مثل ہو۔ آخر جب اس کی تاب دتوں جواب دینے کو تھی اسے ایک بڑھا پھوس زائر ملا، جو سفر کی صعوبتوں سے گھل کر سائے کے سمان رہ گیا تھا۔ اس پر فروت نے بھدوں کی بھالہ بٹاتے ہوئے کہا: — اگر تمہیں اس شہرِ جادو کی تلاش ہے تو چاند کی پہاڑیوں کے ادھر سایوں کی وادیِ طویل میں قدم بڑھاتے گھوڑا دوڑائے آگے ہی آگے بڑھتے چلو.....

معلوم نہیں اس سورمانٹ کو وہ شہرِ تمنا ملا کہ نہیں لیکن سفر جاری رکھنے اور گھوڑا آگے بڑھانے کا بہانہ ضرور مل گیا۔ شاعر کو بھی ذہنی طور پر سند بادِ جہازی یا یوٹیس ہونا چاہیے یعنی اس کے سامنے ایک نہ ایک ایڈوریڈو — ایک نہ ایک چاندنگر کا ہونا ضروری ہے۔ چاند کی پہاڑیوں کے حوالے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دونو شہر یہ دونو منزلیں کہیں ایک نہ ہوں۔ چاند ہمیشہ دور دراز کی محبوب اور بجلی لیکن کٹھن اور ناقابل

حصولِ منزلوں کا سہل رہا ہے جو کوہِ ندا کی طرح مسافروں کو بلاتی تو میں لیکن واپس نہیں
 بھیجتیں۔ سمجھ دار لوگ کبھی ان منازلِ مہم کا رخ نہیں کرتے بلکہ بے چین دہنوں اور
 بے خواب راتوں کے وجود سے بے خبر لطیفوں والے مصوّر پر چمے پڑھتے خوشحال و
 چرخِ حال زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن سنا ہے اگر جادو کے مہم شہروں کی طلب میں
 جولاں رہنے والے دیوانے نہ ہوتے تو یہ زندگی بڑی ہی پاٹ اور بے رنگ ہوتی۔
 آئی گمبھیر اور دنواز کبھی نہ ہوتی — اب یہ اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے کہ گوشہ
 عافیت پسند کرتی ہے یا اس نائٹ کی راہ اختیار کرتی ہے۔

میں افتادِ طبع کے اعتبار سے بے شک رومانی بلکہ الف یلوی واقع ہوا ہوں
 لیکن رہتا ایک ایسی دنیا میں ہوں جو شہرِ زاد کی دنیا سے مختلف ہے۔ میری طویل نظیں
 زیادہ تر گرد و پیش کی سنگین حقیقتوں سے میرے الف یلوی مزاج کے تصادم کی
 پیداوار ہیں۔ لیکن میں نے عشق اور غیر عشق کے محاذوں پر الگ الگ لڑنا پسند کیلئے
 میرے ہاں ”امری جاں انقلاب“ کا آمیزہ نہیں نہ مجھے آنچل کو پرچم بنانے کی ادا
 پسند ہے۔ میرے ہاں آپ کو لذتِ عشق، بہجتِ عشق اور ذلتِ عشق کے ذاتی واردات
 بھی ملیں گے۔ دل کی دیرانی اور وارستگی کی حکایتیں بھی کہ اُداس رات کے آنکھ میں
 پھلے پھر کے سائے میں — کاک کا چاند میں اور اُسے متوالو ناقوں والو میں بکھری

ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اُن کا آخری دن۔ افتاد اور مضامین وغیرہ بھی
 جن میں واضح سیاسی شعور جھلکتا ہے اگر ان نظموں میں بھی کہ ترقی پسند ہیں بعض جگہ
 آپ کو تذبذب یا تشائم کی کیفیت ملتی ہے تو یہ میری ہمتوں کی پستی کی ترجمان ہے اسے
 میں نے اس لیے خارج نہیں رکھا کہ میری شاعری ذاتی شاعری رہے تبلیغی نہ بنے۔

گرم کی پروں کی کہانیوں میں ایک ضدی بونا سر ہا کر کہتا ہے کہ انسانیت کا دھیلہ
 بھر جو ہر میرے نزدیک دنیا بھر کی دولت پر بھاری ہے۔ میری کتنی ہی نظمیں کہ مجھے
 عزیز ہیں اسی دھیلہ بھر انسانیت کے متعلق ہیں۔ دکھ اور آسودگی۔ احتیاج اور
 فراغ، جنگ اور امن زندگی کے بنیادی مسائل ہیں جو شخص ان سے بے اعتنائی برتا
 ہے وہ اپنے زمین زاد بھائیوں سے مخلص نہیں ہو سکتا۔ پھر آج کے زمانے میں ذہنی یا
 جسمی بن باس ممکن بھی نہیں۔ کسی پہاڑ کی کوئی گکھا ایسی نہیں جس تک زہریلی گیس یا تاناک
 راکھ نہ پہنچ سکتی ہو۔ کوئی برندا بن یا پتو بن ایسا نہیں جس کے بطن میں فوجی ہیاروں کا
 اڈہ نہ ہو۔ ہمیں زندہ حقیقتوں سے پیچھا چھڑانے کی بجائے ان سے عہدہ برآ ہونا ہے۔
 انھی میں ایک یہ کہ سوشلزم کا دور واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہے۔ دھاندلی مفاہمت
 اور جنگ سب نسخے پرانے ہیں۔ لوگ انہیں آزمائیں گے۔ نفیاتی منہاٹے بھی دامگیر
 ہوں گے۔ لیکن کسی نظام کی ناکامی کا معیار یہ نہیں کہ اس سے کسی ڈھمل نسلکچوئل
 کی ذہنی تشفی ہو۔ دیکھنا یہ ہے آیا اس سے لاکھوں کروڑوں سادھارن اور
 غیر نسلکچوئل انسانوں کی زندگی میں مسرت اور شادمانی کا گزر ہوا کہ نہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران مجھ میں فنکارانہ احساس نہ جاگاتھا۔ ایک عامی
 کے احساس اور فنکارانہ احساس میں فرق ہے۔ ایک عامی کے طور پر دس پندرہ یا کہ
 سولہ کے سن کے باوجود مسائل کو کچھ سمجھنا اور بات ہے اور جذبے میں وہ تکیا پن
 اور رچاؤ ہونا اور کہ شاعری میں ڈھل سکے۔ کوریا کی لڑائی نے البتہ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ
 دیا اور اس کی بازگشت میری اب تک کی نظموں میں سنائی دے گی۔ میرے لیے جنگ

کسی اخبار کی موٹی سرفی نہیں بلکہ آگ اور تباہی کا نام ہے اور سپاہی محض دردی بندق
 اور تمنہ نہیں بلکہ کسی بیٹے بھائی یا پیارے کا جسم اور روپ ہے ۔
 گ- گبرو ہے کہ بامیس بہاروں میں پلے
 ل- لاشہ ہے کہ دوروز کے اندر سڑ جائے

سارترنے فرانس پر نازی قبضے کے دنوں میں لکھا تھا کہ فرانس میں کمیون کی شکست
 کے بعد لوگوں پر جو ظلم ڈھائے گئے۔ ان کے لیے میں فلا بیئر اور گانکور کو قصودار
 ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ انھوں نے اس کو روکنے کے لیے ایک لفظ بھی تو نہیں لکھا !
 اگر یہ ان کا کام نہیں تھا تو کیا شاں کیدا کا معاملہ وائٹس کے فرائض میں داخل تھا، کیا
 ڈروفس کی وکالت زولا پر فرض تھی۔ کیا کانگو کے مستبد حاکموں کے خلاف آواز بلند کرنے
 کی ذمہ داری آندرے تھید پر عاید ہوتی تھی — ان میں سے ہر شخص نے اپنے مخصوص
 حالات میں ایک بار رُک کر یہ سوچا کہ بحیثیت مصنف کے میری کیا ذمہ داری ہے ؟
 ہمارے ملک پر جرمنی کے قبضے نے ہمیں ہماری ذمہ داری سمجھا دی ہے ۔
 کیا ہمارے دور کی کوئی ذمہ داری نہیں ؟

میں آدرش داد کو ترقی یا ترقی پسندی کے منافی نہیں سمجھتا۔ ہاں آدرش آدرش
 میں فرق ہے۔ ایک منزل پر ایڈیلیزم اور رومانیت — حقیقت پسندی اور ترقی
 پسندی کی حریف نہیں بلکہ حلیف بن جاتی ہیں۔ رومانی انقلابیت غلط لیکن انقلابی
 رومانیت صحیح۔ میری غیر عشقیہ نظموں کو اسی محکمہ پر رکھیے ۔

اب کچھ متفرق باتیں میری شاعری کے متعلق سنتے جائیے۔ میری لکھنے کی رفتار

خاصی سست ہے: بغداد کی ایک رات کی تکمیل میں مجھے چار سال لگے بعض نظمیں میں چھ سات سال سے لکھ رہا ہوں۔ مہینوں خالی گزر جاتے ہیں۔ ہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند دن کے وقفے میں بہت کچھ لکھ دوں۔ شنگھائی "تین راتوں میں لکھی گئی۔" امن کا آخری دن۔ "سرائے" کو جسے کی لڑائی اور کوریائی خبریں جو سب کی سب طویل نظمیں ہیں اٹھ دس دن کے ایک وقفے میں لکھی گئیں۔ میں نے شعر کہنا تو دس گیارہ برس کی عمر میں شروع کر دیا تھا۔ لیکن پہلی نظم اشاعت کے لیے ۱۹۴۴ء میں ایک ادبی پرچے میں بھیجی۔ قیام پاکستان تک کچھ نہ کچھ لکھتا اور چھپتا رہا لیکن سنجیدگی سے شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے جانا چاہیے جب کہ بغداد کی ایک رات چھپی اور لوگوں کی توجہ کی طالب ہوئی۔ اسلوب کے تجربے آپ کو زیادہ تر میری محقر نظموں میں ملیں گے۔ "امن کا آخری دن" میں میں نے پنجابی کی صفت "سی حرفی" کو آزمایا ہے۔ ایک زمانے میں آڈن سے انیسیت تھی جس سے میں نے یہ سیکھا کہ کوئی لفظ اور کوئی ترکیب غیر شاعرانہ نہیں۔ اسے اعتماد کے ساتھ استعمال کرو۔ میرے ہندی کے تھوڑے سے مطالعے نے بھی مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ مجھے رواں دواں بحریں زیادہ مرعوب ہیں۔ غزلوں میں بھی ان کا انتخاب میں نے میر کی تبعیت کے خیال سے نہیں (میر پسندی اور میر سے مزاجی اشتراک اپنی جگہ) بلکہ اپنی آسانی کے لیے کیا ہے۔ محض تقلید میر منظور ہوتی تو یہ بحریں میری غزلوں تک محدود رہ جاتیں نظموں میں نہ بار پاتیں۔

میری نظموں کا جہاں الگ ہے۔ ان کا سماں شام اور رات کا ہے۔ یہ دراصل اس زندگی کے خاکے ہیں جو میں نے ان اٹھائیس برس میں بسر کی ہے۔

گر جا کا گھر مال جو دڈ بجاتا ہے۔ گاڑی کی سیٹی جو گونج اٹھتی ہے۔ ریل کی پٹیا بھی
 کہ مضافات میں نظر آتی ہے اور چاند — آبادیوں اور ویرانوں کا چاند — یہ
 سب ماضی کی کھونٹیاں ہیں جن پر میں نے یادوں کے پیراہن لٹکا رکھے ہیں۔ اب
 آپ میرا ساتھ چھوڑ کر اس چاند نگر کی سیر کیجئے اور میں اسے تلا نعلی دے کر
 کسی نئے سفر پر نکلوں گا۔ نہ مجھے اپنا حسن کا ایلڈوریڈو ملا ہے نہ زندگی کا
 شہرِ تمنا — میری منزل چاند کی پہاڑیوں کے ادھر سایوں کی دادی طویل میں ہے
 اس سے واپسی ہوئی تو جو کچھ دامن میں ہوگا — کلیاں، کانٹے یا غبار —
 وہ پیش کروں گا۔

ابن انشا

۱۵ اپریل ۱۹۵۵

طبع دوم

یہ چاند نگر کی دوسری جھلکی ہے۔ اس پیچ میں کتنا ہی پانی پلوں کے نیچے سے بہہ
 نیا۔ بلکہ کتنے ہی پلوں کو بہا لے گیا۔ چاند جو ناقابل حصول منزلوں کا سہل تھا، انسانی
 کلونج اندازی کی زد میں آ گیا۔ اعتقاد کے کعبے اجڑ گئے اور سوچ کی نیچ پلٹ گئی۔
 سفید اور سیاہ ایک دوسرے میں گھل مل کر رہ گئے۔ کچھ زمانہ بدل گیا۔ کچھ شاعر
 بدل گیا۔ طبع دوم کے وقت بہت کچھ کہنے کو جی چاہا لیکن پھر آج کی پختگی کے مقابلے
 میں اس دور کی تازگی زیادہ عزیز ہوئی — عشق کرنا اور ناکام رہنا بہتر ہے عشق

نہ کرنے سے — لہذا یہ پرانے موسموں کی خوشبو جیسی تھی ویسے ہی پیش ہے۔
 دیا پچے کی تمنحیص کر دی کہ طویل کلام سے جی گھبراتا ہے۔

اس کتاب کو نایاب ہوتے بہت برس ہوتے۔ دوبارہ کتابت ہوتی اور کم ہو
 گئی۔ پلٹیں مشین پر چڑھیں اور اتر آئیں۔ آج پھر اُسے سپرد مطبع اور سپرد خدا
 کرتا ہوں اور اس کے ساتھ نئے مجموعے کو بھی۔

ابن انشا

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء

طبع سوم

یہ طبع سوم اشارہ ہے شاعر کے شاعری کی طرف واپسی کا۔ نئے
 مجموعے کا وعدہ بھی آٹھ سال بعد آج پورا ہو رہا ہے۔ اس موقع پر
 کوئی مذر کرنا مذر گناہ ہوگا۔ یوں سمجھئے صبح کا بھولا شام کو گھر واپس
 آ رہا ہے۔

اس مجموعے میں ایک نظم تو ایسی ہے کہ طبع اول میں تھی، طبع دوم
 میں نہ تھی۔ اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے: وہ نظمیں اور میں "کوچہ کی ٹرائی"
 اور کو دیا کی خبریں! یہ کبھی تو اُس زمانے میں گئی تھیں، ۱۹۵۱ء-۱۹۵۲ء
 میں، اور محالوں میں چھپیں بھی۔ یہی مجموعے میں شامل نہ کی گئی تھیں کیونکہ
 ہمیں حسن سے بھی لگاؤ تھا، ہمیں زندگی بھی عزیز تھی۔ وہ دن ہمارے
 ملک میں آزادہ روؤں کے لئے بڑی سختیوں کے تھے۔ طویل نظموں کے
 پورے جتنے کا آپ ایک ہلکے مزاج پائیں گے جو ہمارے عنفوانِ زندگی
 کا حاصل تھا اور ہے۔ چاند نگر، وہی پڑا چاند نگر۔

ابن انشا

۱۱ جون ۱۹۷۶ء

چاند کے تمنائی

شہرِ دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی
بے مترار سودائی
دل گداز تارِ یکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے
روح و جاں میں بستی ہے
شہرِ دل کی گلیوں میں

تاکِ شب کی بیلوں پر
 شبِ نہیں سرشکوں کی
 بے قرار لوگوں نے
 بے شمار لوگوں نے
 یادگار چھوڑی ہے
 اتنی بات تھوڑی ہے؟

صد ہزار باتیں تھیں
 حیلہ شکیبائی
 صورتوں کی زیبائی
 قامتوں کی رعنائی
 ان سیاہ راتوں میں
 ایک بھی نہ یاد آئی
 جا بجا بھٹکتے ہیں
 کس کی راہ نکلتے ہیں
 چاند کے تمنائی

یہ نگر کبھی پہلے
 اس قدر نہ ویراں تھا
 کہنے والے کہتے ہیں
 قریہ نگاراں تھا
 خیر اپنے جینے کا
 یہ بھی ایک ساماں تھا

آج دل میں ویرانی
 ابر بن کے گھر آئی
 آج دل کو کیا کہیے
 با و فسانہ سر جائی
 پھر بھی لوگ دیوانے
 آگئے ہیں سمجھانے
 اپنی وحشتِ دل کے
 بُن لئے ہیں افسانے
 خوش خیال دُنیا نے

گرمیاں تو جاتی ہیں
 وہ رتیں بھی آتی ہیں
 جب ملول راتوں میں
 دوستوں کی باتوں میں
 جی نہ چین پائے گا
 اور اُوب جائے گا
 آہٹوں سے گونجے گی
 شہرِ دل کی پہنائی
 اور چاند راتوں میں
 چاندنی کے شیدائی
 ہر بہانے نکلیں گے
 آزمانے نکلیں گے
 آرزو کی گیسرائی
 ڈھونڈنے کو رسوائی

سردِ سردِ راتوں کو
 زرد چاندِ بخشے گا
 بے حسابِ تنہائی
 بے حجابِ تنہائی
 شہرِ دل کی گلیوں میں

۶۱۹۵۴

اے متوالو! ناقوں والو!!

اے متوالو ناقوں والو دیتے ہو کچھ اُس کا پتا
نجد کے اندر مجنوں نامی ایک ہمارا بھائی تھا
آخر اُس پر کیا کچھ بیستی، جانو تو احوال کہو
موت ملی یا لیلے پائی، دیوانے کا مال کہو
عقل کی باتیں کہتے والے دوستوں نے اُسے سمجھایا
اُس کو تو لیکن چُپ سی لگی تھی، نابولانا باز آیا
خیر اب اُس کی بات کو چھوڑو۔ دیوانا پھر دیوانا
جاتے جاتے ہم لوگوں کا ایک سندیا لے جانا

آوارہ آوارہ پھرنا چھوڑ کے منڈلی یاروں کی
دیکھ رہے ہیں دیکھنے والے انشا کا اب حال وہی

کیا اچھا خوش باش جواں تھا جانے کیوں بیمار ہوا
 اُٹھتے بیٹھتے میر کی بیتیں پڑھنا اُس کا شعار ہوا
 طور طریقہ اُکھڑا اُکھڑا چہرہ پیلا سخت ملول
 راہ میں جیسے خاک پہ کوئی مسلا مسلا باغ کا پھول
 شام سویرے بال بکھیرے بیٹھا بیٹھا روتا ہے
 ناقوں والو! ان لوگوں کا عالم کیسا ہوتا ہے

اپنا بھی وہ دوست تھا ہم بھی پاس اُس کے بیٹھ آتے ہیں
 ادھر ادھر کے قصے کہ کے جی اُس کا بہلاتے ہیں
 اُکھڑی اُکھڑی بات کرے ہے بھول کے اگلا بارانا
 'کون ہو تم، کس کام سے آئے؟ ہم نے نہ تم کو پہچانا'
 جانے یہ کس نے چوٹ لگائی، جانے یہ کس کو پیار کرے
 تمہی کہو ہم کس کو ڈھونڈیں، آہیں کھینچے نام نہ لے
 پیت میں ایسے جان سے یار کتنے لوگ گزرتے ہیں
 پیت میں ناحق مر نہیں جاتے پیت تو سارے کمرتے ہیں

اے متوالو ناقوں والو! نگری نگری جاتے ہو
 کہیں جو اُس کی جان کا بیری مل جائے یہ بات کہو
 چاک گریباں اک دیوانہ پھرتا ہے حیراں حیراں
 پتھر سے سر پھوڑ مرے گا، دیوانے کو صبر کہاں
 تم چاہو تو بستی چھوڑے تم چاہو تو دشت بسائے
 تم چاہو تو کچھ دن جی لے دامن سی لے ہوش میں آئے
 اے متوالو ناقوں والو — ورنہ اک دن یہ ہوگا
 تم لوگوں سے آتے جاتے پوچھیں گے انشا کا پتا

یہ سراتے ہے

یہ سراتے ہے ، یہاں کس کا ٹھکانا ڈھونڈو
یاں تو آتے ہیں مسافر سوچلے جاتے ہیں

ماں یہی نام تھا کچھ ایسا ہی چہرہ ہرا
یاد پڑتا ہے کہ آیا تھا مسافر کوئی
سُونے آنکھ میں پھرا کرتا تھا تنہا تنہا
کتنی گہری تھی نگاہوں کی اداسی اُس کی
لوگ کہتے تھے کہ ہوگا کوئی آسیب زدہ
ہم نے ایسی بھی کوئی بات نہ اُس میں دیکھی

یہ بھی ہمت نہ ہوئی پاس بٹھا کے پوچھیں
دل یہ کہتا تھا کوئی درد کا مارا ہوگا

لوٹ آیا ہے جو آواز نہ اُس کی پائی
 جانے کس در پہ کسے جا کے پکارا ہوگا
 یاں تو ہر روز کی باتیں ہیں یہ جیتنیں ماتیں
 یہ بھی چاہت کے کسی کھیل میں مارا ہوگا

ایک تصویر تھی — کچھ آپ سے ملتی جلتی
 ایک تحریر تھی — پر اس کا تو قصہ چھوڑو
 چند غزلیں تھیں کہ لکھیں کبھی لکھ کر کاٹیں
 شعر اچھے تھے — جو سُن لو تو کلیجہ تھامو
 بس یہی مال مسافر کا تھا ہم نے دیکھا
 جانے کس راہ میں کس شخص نے لوٹا اس کو

گُزرا کرتے ہیں سُلگتے ہوئے باقی ایام
 لوگ جب آگ لگاتے ہیں جُجھاتے بھی نہیں
 اجنبی پیت کے ماروں سے کسی کو کیا کام
 بستیوں والے کبھی ناز اٹھاتے بھی نہیں

پھین لیتے ہیں کسی شخص کے جی کا آرام
پھر بلاتے بھی نہیں ، پاس بٹھاتے بھی نہیں

ایک دن صبح جو دیکھا تو سر اٹے میں نہ تھا
جانے کس دیس گیا ہے وہ دوانا۔ ڈھونڈو!
ہم سے پوچھو تو نہ آئے گا وہ جانے والا
تم تو ناحق کو بھٹکنے کا۔ سانا ڈھونڈو
یاں تو آیا جو مسافر یونہی شب بھر ٹھہرا
یہ سر اٹے ہے۔ یہاں کس کا ٹھکانا ڈھونڈو

کاتک کا چاند

چاند کب سے ہے سر شاخِ صنوبر اٹکا
گھاسِ شبِ غم میں شرابِ لے ہے شب ہے آدمی
بامِ سونا ہے، کہاں ڈھونڈیں کسی کا چہرا
(لوگ سمجھیں گے کہ بے ربط ہیں باتیں اپنی)
شعر اُگتے ہیں دکھی ذہن سے کوئل کوئل
کون موسم ہے کہ بھر پور ہیں غم کی بیلیں
دور پہنچے ہیں سرکتے ہوئے اُدے بادل
چاند تنہا ہے (اگر اس کی بلاتیں بے لیں؟)
دوستو جی کا عجب حال ہے، لینا بڑھنا
چاندنی رات ہے کاتک کا مہینا ہوگا
میرِ مغفور کے اشعار نہ پیہم پڑھنا
بیٹنے والوں کو ابھی اور بھی جیسا ہوگا

چاند ٹھنکا ہے سرِ شاخِ صنوبر کب سے
 کونسا چاند ہے۔ کس رُت کی ہیں راتیں لوگو
 دُھند اُڑنے لگی۔ بُننے لگی کیا کیا چہرے
 اچھی لگتی ہیں دوانوں کی سی باتیں لوگو
 بھیکتی رات میں دبکا ہوا جھینگر بولا
 کسماتی کسی جھاڑی میں سے خوشبو پکی
 کوئی کاکل، کوئی دامن، کوئی آنچل ہوگا
 ایک دُنیا تھی مگر ہم سے سمیٹی نہ گئی

یہ بڑا چاند۔ چمکتا ہوا چہرہ کھولے
 بیٹھا رہتا ہے سرِ بامِ شبستاں شب کو
 ہم تو اس شہر میں تنہا ہیں، ہمیں سے بولے
 کون اس حُسن کو دیکھے گا یہ اس سے پوچھو
 سونے لگتی ہے سرِ شام یہ ساری دُنیا
 ان کے حجر دوں میں نہ در ہے نہ دریکہ کوئی

ان کی قسمت میں شبِ ماہ کو رونا کیسا
ان کے سینے میں نہ حسرت نہ تمنا کوئی

کس سے اس دردِ جدائی کی شکایت کہیے
یاں تو سینے میں نیستاں کا نیستاں ہوگا
کس سے اس دل کے اُجڑنے کی حکایت کہیے
سُننے والا بھی جو حیراں نہیں، حیراں ہوگا
ایسی باتوں سے نہ کچھ بات بنے گی اپنی
سوئی آنکھوں میں نرا شا کا گھلے گا کاہل
خالی سپینوں سے نہ اوقات بنے گی اپنی
یہ شبِ ماہ بھی کٹ جائے گی بے کل بے کل

جی میں آتی ہے کہ کمرے میں بُلا لیں اس کو
چاند کب سے ہے سرِ شاخِ صنوبر اٹکا
رات اس کو بھی نِگل جائے گی بولو بولو
بام پر اور نہ آئے گا کسی کا چہرہ

اے مرے سوچ نگر کی رانی

تجھ سے جو میں نے پیار کیا ہے، تیرے لئے؟ نہیں اپنے لئے
وقت کی بے عنوان کہانی، کب تک بے عنوان رہے
اے مرے سوچ نگر کی رانی، اے مرے خلدِ خیال کی حور
اتنے دنوں جو میں گھلتا رہا ہوں تیرے بنا، یوں ہی دُور
سوچ تو کیا پھل مجھ کو ملا، میں من سے گیا پھر تن سے گیا
شہرِ وطن میں اجنبی ٹھہرا۔ آخر شہرِ وطن سے گیا
روح کی پیاس بجھانی تھی پر یہاں ہونٹوں کی پیاس بھی مجھ نہ سکی
بچتے سنہلے بھی ایک سُسلگتا رُگ بنی مرے جی کی لگی
دُور کی بات نہ سوچ ابھی مرے مات میں تو ذرا بات تو دے
تجھ سے جو میں نے پیار کیا ہے، تیرے لئے؟ نہیں اپنے لئے

باغ میں ہے اک بیلے کا تختہ بھینی ہے اس بیلے کی گندھ
 اے کلیو کیوں اتنے دنوں تم رکھے رہیج اسے گود میں بند
 کتنے ہی ہم سے رُپ کے رسیا آئے یہاں اور چل بھی دیئے
 تم ہو کہ اتنے خُسن کے ہوتے ایک نہ دامن تھام سکے
 صحنِ چمن پر بھونروں کے بادل ایک ہی پل کو چھائیں گے
 پھر نہ وہ جا کر لوٹ سکیں گے پھر نہ وہ جا کر آئیں گے
 اے مرے سوچ نگر کی رانی وقت کی باتیں رنگ اور بُو
 ہر کوئی ساتھ کسی کا ڈھونڈے کُل ہوں کہ بیلے میں ہوں کہ تو
 جو کچھ کہنا ہے ابھی کہہ لے جو کچھ سُننا ہے سُن لے
 تجھ سے جو فیں نے پیار کیا ہے تیرے لئے؛ نہیں اپنے لئے

دل کی نہ پوچھو کیا کچھ چاہے دل کا تو پھیلا ہے دامن
 گیت سے گال غزل سی آنکھیں ساعدِ سیمیں برگِ دہن
 جوڑے کے انہی پھولوں کو دیکھو کل کی سی ان میں باس کہاں
 ایک اک تارا کر کے ڈوبی مانتے کی طنازِ افشاں

سہنے کا دکھ سہ نہ سکے، ہم، کہنے کی باتیں کہہ نہ سکے
 پیاس ترے کبھی آنہ سکے، ہم، دور بھی تجھ سے رہ نہ سکے
 کس سے کہے اب رُوح کی بیٹا، کس کو سنائے من کی بات
 دور کی راہ، بھٹکتا راہی، جیون رات گھنیری رات
 ہونٹوں کی پیاس بھجانی ہے اب ترے جی کو یہ بات لگے نہ لگے
 تجھ سے جو میں نے پیار کیا بے تیرے لٹے؟ نہیں اپنے لئے

۱۹۵۴ء

غَمِ رَایِگاں

پھر بہار آئی ہے پھر کلیوں نے مہکائے ہیں بن
لیکن اے یار و خزاں ابھی کہ سینے کی جلن؟
آج تو بھادوں کی برکھا ہو گئے آنکھوں کے نیر
صبح دم دیکھیں گے اُجلا ہے کہ میلا پیر ہن
چاند کن پٹروں کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گیا
اس اندھیرے میں قیامت ہو چلی جی کی دُکھن
اپنی راتوں کی فغاں، تیری صدائے پی کہاں
اے پیسے اپنی قسمت میں کہاں پی کا ملن؟

کل بھی اندھیا اے گھنیرے راستے تاریک تھے
کل بھی اس دامن کی دولت تھا غمِ دل کا غبار
کل بھی مجھ جاتے تھے، جل اٹھتے تھے یادوں کے دیے
کل بھی دل پر ہاتھ جا پڑتا تھا یونہی بار بار

کل بھی آشفۃ تھی افتادہ تھی واماندہ اُمید
اپنے کانوں تک پہنچ پاتی نہ تھی اپنی پیکار
لہریے بنتے تھے بیابانی سے انجانے سے گیت
جھنجھنا اُٹھتے تھے ہر جھونکے پہ غمگینی کے تار

لیکن اتنی بھی سہانی تھی کہاں داغوں کی سیر
جی بیا کل ہی سہی اتنا مگر خود سے نفور؟
آج تو جی کی لگی لینے لگی صدیوں کا بیر
چاند نکلا ہے۔ کھلے انبر سے لیکن دُور دُور
بن کی پہنائی میں پھر چھائی ہے پھولوں کی سگندہ
آج تو اُن کو بھی اس محفل میں لانا ہے ضرور
اُس میں بھیگا پیپیا سر پٹک کر سو گیا
اور تُو؟ تیرا نہیں تیرے ستاروں کا تصور

کارواں درکارواں سپینوں کو بسرا ئے ہونے
لوگ تو جانے لگے انشا چلو تم بھی چلو
کب تک اپنے کتاں بیٹنے سے چمٹائے ہوئے

بے کفن لے کے پھر دگے چاندنی کی لاش کو
 کون سے پی سے لگائی ہے اُمید باز دید
 کون سے پی کے لئے بیتیں کہو غزلیں لکھو
 چاند میلا ہے، ستارے دور ہیں، لمبی ہے رات
 بیکراں ہے دردِ مہجوری کا سا گر دوستو

تم پہ تو بے نام جادو کر گئی کرنوں کی بات
 لوٹ جائے گی مگر شب بھر چمک کر چاندنی
 دل کی ہر دھڑکن کو دے جائے گی صدیوں کا ثبات
 بے اماں، بے مہر، بے پروا، ستمگر چاندنی
 دن کو کس کلفت سے پہنچاتی ہے وحشت تا بہ شام
 اور پھر کھولے ہے جو دکھڑوں کا دفتر چاندنی
 جانے کس کس آس کی پاداش ہیں اپنے نصیب
 یعنی اکثر عشق، اکثر درد، اکثر چاندنی

سال آتے ہیں گزر جاتے ہیں رہتا ہے وہیں
 بے شکن بستر کو مہکا تا سوا بلبوں کا دھیر

ہم جو ہر جانی نہیں پھر کوئی ہر جانی نہیں
 ایک اک پسنے میں اک مہوش ہے اور کتنا دلیر
 یونہی بے پوچھے ہی در آتا ہے ہر تازہ خیال
 یونہی ہر قامت کے اپنانے میں ہو جاتی ہے دیر
 گونجتی ہیں من کی ویرانی میں کیا کیا آہٹیں
 اوریوں ہر شام کی ہوتی ہے مشکل سے سویر

دل کی انگنائی کو گرماتی ہے ہر موسم کی دھوپ
 کون جانے باغ میں اب کے بے کس رت کا چلن
 اتنے دامن اتنے انجل اتنے چہرے اتنے روپ
 کونسی ان میں سے ہے اپنے خیالوں کی دِلہن
 آسمان ہے، وادی انجم ہے، تنہا چاند ہے
 کوئی دیوانہ پس محل رواں خود میں مگن
 اوریاروں کو ابھی ضد ہے کہ اُٹھ کے دیکھ لو
 پھر بہار آئی ہے پھر کلیوں نے مہکائے ہیں بن

ایسی راتیں بھی کتنی گزری ہیں

کہاں گیا تھا — گھڑی دو گھڑی میں لوٹ آیا
شبِ فراق کا تارا — رکاب میں لایا
اُداس شام — ابھی کتنی رات باقی ہے!

یہ آج کونسی تاریخ تھی مہینے کی
میرِ تمام سرِ آسماں اُبھر آیا
میرِ تمام — ابھی کتنی رات باقی ہے؛

سُنو سُنو وہ کسی دُور کے محلے میں
اُدائے خاص سے ہے پہرہ دار چلایا
کسی کا نام — ابھی کتنی رات باقی ہے؛

وہ چرچ روڈ کے گھنٹے نے دو بج بھی دیئے
رہ پھیل پھیل چلا نیم کا گھنا سایا
یہ صحن و بام — ابھی کتنی رات باقی ہے۔

یہ کس کے پاؤں کی بھانجن تھی کس نفس کی سگندھ
 یہ کس کے رُخ کا اُجالا ہوا تھا — کون آیا
 خیالِ خام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

حریفِ مرحلہ ہفتِ خواں ہے منزلِ عشق
 اسی طرح جو دلِ بے مترار بھرا آیا
 بہر مقام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

ستارہٴ سرِ مشرقِ غبارِ رہ سے طول
 دیارِ دُور سے یاں تک تو کس طرح آیا
 بہ این خرام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

اُفق پہ غولِ بیاباں ہے یا سپیدہٴ صبح
 شبِ فراق تجھے یاں تک تو پہنچایا
 بہ اہتمام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

لوگ پُو چھیں گے

لوگ پُو چھیں گے کیوں اداس ہو تُم
اور جو دل میں آئے سو کہیو !
یُو نہی ماحول کی گرا نی ہے ،
'دن خزاں کے ذرا اداس سے ہیں'
'کتنے بو جھل ہیں شام کے سائے'
اُن کی بابت خموش ہی رہیو
نام اُن کا نہ درمیاں آئے

نام اُن کا نہ درمیاں آئے
 اُن کی بابت خموش ہی رہو
 'کتنے بوجھل ہیں شام کے سائے'
 'دن خزاں کے ذرا اداس سے ہیں'
 'یو نہی ماحول کی گرانی ہے'
 اور جو دل میں آئے سو کہیو!

لوگ پوچھیں گے کیوں اداس ہو تُم؟

ساتے سے

کیوں مرے ساتھ ساتھ آتا ہے؟
میری منزل ہے بے نشان ناداں؟
ساتھ میرا ترا کہاں ناداں؟

تھک گئے پاؤں، پڑ گئے چھالے
منزلیں ٹمٹما رہی ہیں دُور—!
بستیاں اور جا رہی ہیں دُور—!

میں اکیلا چلوں گا اے سائے
 کون عہدِ وفا نبھاتا ہے ؟
 کیوں مرے ساتھ ساتھ آتا ہے ؟

تُو ابھی جا ملے گا سایوں میں
 میں کہاں جاؤں میں کہاں جاؤں ؟
 کس کی آغوش میں اماں پاؤں

انتظار کی رات

اُڑے آتے ہیں شام کے سائے
دم بدم بڑھ رہی ہے تاریکی
ایک دُنیا اُداس ہے لیکن
کچھ سے کچھ سوچ کر دلِ وحشی
مُسکرانے لگا ہے۔ جانے کیوں؟

وہ چلا کارواں ستاروں کا
 جھومتا ناچتا سوئے منزل
 وہ افق کی جبین دمک اٹھی
 وہ فضا مُکرائی — لیکن دل
 ڈوبتا جا رہا ہے — جانے کیوں

وہ درپکے

کب سے اس چوک میں کھڑا ہوں میں
اُن دریچوں کو تک رہا ہوں میں
ہائے کیا یاد آگیا اے دوست
ذکر ہے پارِ سال کا اے دوست
بارِ ہاسیر کے لئے جاتے
میں نے اس راہ سے گزرتے ہوئے
ایک مدقوقِ ساحیں چہرہ
ان دریچوں سے جھانکتے دیکھا
رکتے موہومِ دلوںے جانے
ہر نظر میں تڑپ رہے ہوتے
جیسے کوئی خزاں زدہ پودا
ہو یہی سوچ سوچ کر جیتا

ہیں کوئی دن - یہ انتظار کے دن

پھر پلٹ آئیں گے بہار کے دن

جا کے پردیس لوٹ آیا ہوں

اور اسی راہ سے گزرتا ہوں

لیکن اے دوست اب کبھی میں نے

یہ دریچے کھلے نہیں دیکھے

حُسنِ بیمار مرگیا شاید

سوچتا ہوں خزاں زدہ پودا

انتظارِ بہار کر نہ سکا

تھا بہاروں سے آشنا شاید

اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

(ایک نامرید کا کہنا)

۱۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی

ٹوٹے جانے لگا کب تک کہ ہوا کچھ بھی نہیں
اے دل اس درد کی سنتے ہیں دوا کچھ بھی نہیں
کس لئے چین سے محروم ہیں اپنے شب و روز
کچھ سمجھ میں نہیں آتا، بخدا کچھ بھی نہیں
مہرباں بھی ہیں، محبت بھی ہے ان کو ہم سے
لوگ کہتے ہیں، مگر ہم کو پتا کچھ بھی نہیں
آزمائیں تو سہی جذبِ محبت انشا
ان کی نظروں میں چلو مان لیا کچھ بھی نہیں

۲۔ دل و جانم بتو مشغول و نگاہم چپِ راست
 تانہ و انسِ حریفان کہ تو منظورِ منی
 اے تو کہ ترے حسن کا شہرہ ہے جہاں میں
 کیوں عشق پہ احسان گوارا نہیں تجھ کو
 یہ برہمی نشتر ہے ہماری دگِ جاں میں
 کیوں پاس کچھ اے دوست ہمارا نہیں تجھ کو

کچھ لطفِ شبانہ کی نہ خوشبو کی بوس ہے
 ہم رنگ پرستوں کی جسارت پہ نہ جانا
 اک لمحہ شیریں کا ہمیں لمس بھی بس یہی
 اے غنچہ نو یافتہ پہلو نہ چرانا

ہم آہ بھر میں، نالہ کریں، کچھ نہ کہیں تو
 سب تیرے لئے۔ تجھ کو یقین آئے نہ آئے
 یادوں نے کبھی کیفیتِ درد جو پوچھی
 ہم نے انہیں برجستہ فلنے ہی سنائے

پر تم سے تو پوشیدہ نہیں اپنی حکایت
 اس رشتہ نازک کو نہ الجھاؤ تو اچھا
 اب اور بڑھاؤ نہ غم صبر طلب کو
 اب پردہ دُوری سے نکل آؤ تو اچھا

۳۔ کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ
 زلف برہم کئے، باچشمِ حجاب آلودہ
 بالوں میں تم سے شانہ بنیں انگلیاں میری
 باہوں کو تری تکیہ رخسار بنا یا
 چپکے سے کبھی ڈوب گیا چاہِ ذوق میں
 زلفوں کو لبوں سے کبھی بلکوں سے لگایا

اس شب کی سحر برقِ بلا تھی کہ پھلاوا
 اس رات نہ خستہ تھے نہ واماندہ تارے
 رخسار ترے سینہ بریاں سے لگا کے
 ہم سو نہ سکے کلفتِ ایام کے مارے

پھر سر پہ تھا خورشیدِ حقیقت کا اُجالا
 پھر خواب پریشاں تھے خیالوں کی رہوں میں
 تم تھے کہ تصور ہی سے آباد تھی دُنیا
 سرگوشیاں ہوتی ہی وہیں خواب گہوں میں

کچھ تجھ کو خبر ہے کہ عنبرِ نیم شبی میں
 میں تیری عنایت کے سہارے ہی جیا تھا
 وحشت کے بیا باں میں مری تشنہ لبی نے
 انعام میں اک قطرہ شبنم ہی پسایا تھا

لیکن اسی اک قطرہ شبنم کی طلب میں
 اُمید سے محروم جہاں گرد تھا کب سے
 اس کی بھی نظر میں تھی یہ دزدیدہ نگاہی
 راہی کو گزرتا تھا مگر منزلِ شب سے

اب موت گوارا نہ ترا، مجھ گوارا
 ہم منتظر آمدِ سردا ہی رہیں گے
 تو خوب سمجھتا ہے نگاہوں کی زباں کو
 کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہ کہیں گے

۴۔ دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
 کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
 تمہیں تعجب ہوا ہے شاید مجھے جو ہے عشق تم سے کیوں ہے
 کہ تم سے بڑھ کے حسیں تو مجھ کو ہر ایک کچے میں مل سکے گا

تم اپنے دل میں سمجھ رہے ہو، یہ خام کاری ہے یا جنوں ہے
 ذرا تغافل سے کام لو گے تو خود ہی میدان چھوڑ دے گا

ابھی یہ کل ہی کی بات ہے تم کو اس قدر تھا خیال میرا
 کہ شاید اپنے پہ جبر کر کے بھی میری ہر بات مانتے تھے
 ابھی یہ کل ہی کی بات ہے تم ادا اس لمحاتِ نیم شب میں
 مسکے دلِ شیفہ کی تسکین کو حاصلِ زیست جانتے تھے

تو پھر یہ اپنا قصور مانو — تمہی نے لمحاتِ نیم شب میں
 مے دل درد مند کو ایک آرزو دے جیات بخشی
 مجھے تو اس رات کی سحر کی نہ آرزو تھی نہ یہ خبر تھی
 کہ اس سفینے کو غم کا ظلمات پار کرنا ہے لازمی بھی

میں دُور رکھوں گا خود کو تم سے تمہارے گھر بھی نہ آؤں گا
 مگر تم اپنی شفیق نظروں میں اجنبیت سموسکو گے
 اگر میں راتوں کو کاہشِ غم سے تاسر جاگتا رہوں گا
 تو اس قدر پاس رہ کے بھی مجھ سے اس قدر دُور ہو سکو گے؟

مجھے تو منظور ہے یہ سب کچھ میں دے کے جی لوں سسکا کے جی لوں
 مگر مری ایسی زندگی پر تمہی کو شاید ملال ہو گا

نہ جانے کس کس شفیق دل پر یہ شقاق گزے گا میرا مرنا
 مرا مرض لا دوا نہیں تھا — مگر یہ کس کو خیال ہو گا

۵۔ ایک غزل مناسب حال

دل نے ہمارے بیٹھے بیٹھے کیسے کیسے روگ لگائے
 خم نے کسی کا نام لیا اور آنکھوں میں اپنی آنسو آئے
 جتنی زبانیں اتنے قصے اپنی اداسی کے کارن کے
 لیکن لوگ ابھی تک یہ سادہ سی پہلی بوجھ نہ پائے
 عشق کیا ہے؟ کس سے کیا ہے؟ کب سے کیا ہے؟ کیسے کیا ہے؟
 لوگوں کو اک بات ملی اپنے کو تو لیکن رونا آئے
 راہ میں یونہی چلتے چلتے اُن کا دامن تھام لیا تھا
 ہم ان سے کچھ مانگیں چاہیں ہم سے تو یہ سوچا بھی نہ جائے
 نجم مھر کے چہرے سے انشا اتنی بھی اُمیدیں نہ لگاؤ
 ایسا بھی ہم نے دیکھا ہے اکثر رات کٹے اور صبح نہ آئے

۔ لو آج کی شب بھی سوچکے ہم

شامِ جدائی پھر لوٹ آئی سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا
 اک بے نام کسکے ہاتھوں بات بات پر دل بھر آیا
 آج بھی شاید ساتھ تمہارا منزل تک دینا ہے تسارو
 پہلے بھی ہم نے اکثر تم کو صبح کی **داری** تک پہنچایا

آنکھ مچولی کھیل کریں گے کب تک یہ راتوں کے دُھندلے
 چاپ چاپ پر دل پوچھے گا یہ کون آیا یہ کون آیا
 انشا جی پھر اتنے سویرے صبر کا دامن چھوڑ رہے ہو
 پچھلی رات کا درد ابھی تک سینے سے ٹٹنے نہیں پایا

۷۔ شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

دل درو میں گھلتا رہے، یہ کس کو گوارا ہے
 ہم کو تو مگر یارو، یہ درو ہی پیارا ہے
 امید کا ہر لمحہ اب وصل کا لمحہ ہے
 جب دُور کنارا ہو، ہر موج کنارا ہے
 اس زلف نے اپنے کو کیا کیا نہیں آکھایا
 جس زلف کو خود ہم نے سو بار سنوارا ہے
 وہ رات گئی انشا، وہ بات گئی انشا
 اب کس لئے جیتے ہو اب کس کا سہارا ہے

دغیرہ دغیرہ

انسانے پھر عشق کیا

(ایک اور نامربوط کہانی)

انسانے پھر عشق کیا انسان صاحب دیوانے

اپنے بھی وہ دوست ہوئے ہم بھی چلیں گے سمجھانے

اپہیمان محبوب سے :

اپنے کو ہم اس شہر میں رسوا نہ کریں گے

اب تک جو ہوا خیر، اب ایسا نہ کریں گے

وعدہ ہے کہ اب اور جلائیں گے نہ جی کو

نقصان ہے اس میں تو یہ سودا نہ کریں گے

تا شام نہ ان کو چوں میں گھو میں گے پریشاں

تا صبح شبِ ماہ میں جاگنا نہ کریں گے

ہر موڑ پہ ٹھٹکیں گے نہ دیوانوں کی صورت
 ہر در پہ تجھے جا کے پکارا نہ کریں گے
 لکھیں گے کسی اور ہی عنوان کی نظمیں
 غزلوں میں بھی اس بات کا چرچا نہ کریں گے

۲۔ باتیں اپنے دل کے ساتھ

وعدہ تو کیا ہے مگر ایفا نہ کریں گے
 ایفا جو کریں گے کوئی اچھا نہ کریں گے
 لوگوں سے چھپالیں گے جو احوال ہے جی کا
 اپنے سے کسی بات میں دھوکا نہ کریں گے
 اے دل ترے فرمانوں کو ٹالا ہے نہ ٹالیں
 اُن کی بھی ترے سامنے پروا نہ کریں گے
 اس راہ کو ہم چھوڑ کے جائیں کسی جانب
 آزدہ نہ ہو۔ ہم کبھی ایسا نہ کریں گے
 لکھیں گے اُسی ٹھاٹ سے نظمیں، کبھی غزلیں
 ہاں آج سے لوگوں کو دکھایا نہ کریں گے

۳۔ خطاب کسی دوست کا لوگوں سے:

بہم نے نہ کہا تھا کہ وہ کیا کیا نہ کریں گے
ہاں صبر کی کہتے ہو تو انشا نہ کریں گے
بڑھ جائے گا آزارِ محبت۔ بے یہ لوگو
وہ ایک نظر دیکھ کے اچھا نہ کریں گے؟
اُن سے یہ کہو ایسے دو انوں سے نہ الجھیں
سن لیں گے مگر آپ کا کہنا نہ کریں گے
سائل ہیں فقط ایک غایت کی نظر کے
یہ اور کسی شے کا تقاضا نہ کریں گے
در سے نہ اٹھائیں وہ ضمانت پہ ہمارا
مُرسوا ہیں مگر آپ کو مُرسوا نہ کریں گے

۴۔ باب چہارم۔ در مسافرت

وہ جی میں کوئی بات جو لاتے ہیں عزیزو!
یہ سب نہ کریں گے۔ چلو اچھا نہ کریں گے

تنہائی میں لے جائیں گے سمجھائیں گے دل کو
 یہ مان بھی جائے گا یہ دعوے نہ کریں گے
 اتنا بے کہ چھوڑیں گے یہ دیوانوں کی صورت
 ہم کل سے سرِ راہ بھی بیٹھا نہ کریں گے
 ہو جائیں گے جا کر کہیں پر دیس میں نوکر
 یاں سال میں اک بار بھی آیا نہ کریں گے
 اس شہر میں آئندہ نہ دیکھیں گے وہ ہم کو
 کیا کیا نہ کیا عشق میں، کیا کیا نہ کریں گے اُ

فرد گزاشت

دردِ رسوا نہ تھا زمانے میں
دل کی تنہائیوں میں بتا تھا
حرفِ ناگفتہ تھا فسانہٴ دل
ایک دن جو انہیں خیال آیا
پوچھ بیٹھے: اُداس کیوں ہو تم؟
’بس یونہی‘ مسکرا کے میں نے کہا
دیکھتے دیکھتے سرِ مڑگاں
ایک آنسو مگر ڈھلک آیا
عشق نورس تھا — خام کار تھا دل!

بات کچھ بھی نہ تھی مگر ہمدم

اب محبت کا وہ نہیں عالم

آپ ہی آپ سوچتا ہوں میں

دل کو الزام دے رہا ہوں میں

ورد بے وقت ہو گیا رسوا

ایک آنسو تھا پی لیا ہوتا

حسنِ محتاط ہو گیا اُس دن

عشق تو قیر کھو گیا اُس دن

پائے کیوں اتنا بے قرار تھا دل

اُداس رات کے آنکھیں میں

اُداس رات کے آنکھیں میں رات کی رانی
مہک رہی ہے — دل بے قرار بات تو سن
فلک پہ نکلا ہے پیلا دھلا دھلا یا چاند
کہاں سے چل کے کہاں تک ہے دیکھ آیا چاند
کوئی خیال — کوئی یاد — آرزو کوئی
بڑے بہانے تھے جی کے گداز کرنے کو

مگر تو چپ ہے سر آغازِ شام سے چپ ہے
شبِ اگست کے افسانہ خواں دھندلکے میں
چمک رہی ہے — پڑی گھولتی ہے دیرانی
اُداس رات کے آنکھیں میں رات کی رانی

گھڑی کی سوئیاں پیہم خرام آمادہ
مگر مسافرِ شب ، خستہ جان افتادہ
گزرتے وقت کی وادی میں ایک منزل پر
ٹھٹک گیا ہے غبارِ نجوم میں کھو کر
کہ ایک ریل کی سیٹی خموش مدھم سی
اُجالتی ہے تمنا کی رہ گزارِ بعید۔

سوادِ شہر کی بستی کا یہ شکستہ پُل
گئی بہار کی بے برگ و بار بیلوں میں
اُلجھ گیا ہے — مگر پوچھئے تو بیگانہ

بُجھا بُجھا سا دیا کوئی جھلملاتا ہے
سوادِ شہر کی بستی کی خالقہ کے پاس
کہ رفتگانِ روِ دُور کا مجاور ہے

یہ رہ گزار وہی جس سے ساربانوں کا
 علی الصباح گزرتا ہے قافلا کوئی
 تمام رات پڑی کروٹیں بدلتی ہے
 نہ جانے کس کے غم انتظار میں بے چین

بہت ملول بہت زرد ہو چلا ناگاہ
 ابھی تو دیکھا تھا ہم نے دھلا دھلا یا پاند
 کہاں سے آیا ہے کیسا پیام لایا چاند

اُجاڑ بستیوں ویران راستوں میں اُداس
 بھٹکنے والے کو اب بھی سدا میں آتی ہیں
 گزرتے قدموں گلوگیر سرد آہوں کی
 مگر مسافرِ شب کا روانِ رفتہ مہین
 کسی کو کس طرح آوازِ پاس سے پہچانے
 یہ لوگ اس کے لئے آشنا نہ بیگانے

گزر بھی جاتو ہماری طرف ٹھٹک کے نہ دیکھ
 گھلے ملے سے نقوشِ خفی کے ابرِ رواں
 کہ وسعتیں ہیں سیہ آسماں کی بے پایاں

تو کون شہرِ وفا کا کوئی پیامی ہے ؟
 ترے جو دل میں کوئی داغِ ناتمامی ہے
 شبِ اگست شبِ بے قرار کے مہتاب
 شبِ دواز دھم کے دھلے دھلائے چاند
 مرے عزیز کہیں اور جا کے دستک دے
 کہ اس جوار کے لوگوں کو جانتا ہے تو
 کہ یہ نواح کئی سال سے ہے کم آباد
 رہا نہیں ہے محبت کے کام کا کوئی
 نہیں یہاں نہیں انشا کے نام کا کوئی !

والسی

بستیاں قریے گھوم چکے اب دشت کو لوٹیں بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو! آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

”تم اور ہم سے پیار کرو گے؟ جھوٹ ہے لو بھی بنجارو
بیچو گے بیوپار کرو گے، تم سے دُور بھلے پیارو“

بیٹھا ہے وہ جو آگ جلائے، کھوہ کے مُنہ پر چرواہا
وہ بھی ہے تیر کمان سجائے اس سے بھی ہم کو بچنا ہوا

بچھم میں جہا پٹر گھنے ہیں، ان سے بھی لوگو دُور ہی دُور
ان میں وہ اپنی جان کے بیری چیتے باگھ چھپے ہیں ضرور

ہر کوئی دیکھ کے جال بچھائے، ہر کوئی اٹھ کے وار کرے
 بستیاں قریے گھوم چکے ہم، کوئی نہ ہم سے پیار کرے
 لائے تھے ہم اسے کس کو دکھانے، لے چلیں دُکھتے من کو چلیں
 شام ہوئی آوارہ غزالو، آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

صبا کا ایک جھونکا

گلشن سے صبا کا ایک جھونکا بیگانہ صفت گزر گیا ہے

شکلیں نہیں ذہن میں گلوں کی

باتیں نہیں یاد دوستوں کی

کرتے رہے لوگ کچھ اشارے

آتے رہے کا کلیں سنوائے

ہونٹوں پہ تبسموں کا جادو

آنکھوں میں عجیب شخص ہے تُو،

دل اجنبی اجنبی بچارا

یہ حیرتوں حسرتوں کا مارا

بیٹھا رہا سوز سا جگائے

یعنی؛ کوئی اس طرف نہ آئے

مُکُشن کا ہر اک نہال چونکا
 گلشن سے صبا کا ایک جھونکا
 بیگانہ صفت گزر گیا ہے

دل کا ہے عجیب حال لوگو اتنا ہے تمہیں خیال لوگو؟
 ایسے بھی ہیں نجد میں دوانے
 رہتے ہیں جو عشق میں بھی سیانے
 کہنے میں کبھی نہ جی کے آئیں
 اپنے سے بھی آپ کو چھپا ئیں
 دل میں تو ہزار آرزو ہے
 ہونٹوں پہ کچھ اور گفتگو ہے
 لوگوں نے کبھی جو حال پوچھا
 کیسے ہو کہو: سوال پوچھا
 کہنا یہی آپ کی دعا ہے
 بیگانہ صفت گزر گیا ہے

گلشن سے صبا کا ایک جھونکا

گلشن سے خراب لوٹ آئے ہم نے تو یہ سال بھی گنوائے

گلشن تھا کہ قریہ نگاراں

اپنے یہ نصیب تھے نہ یاراں

کلیوں سے گلوں سے پیار کرتے

وحشت کوئی اختیار کرتے

چٹکا کیا دل کا ایک گھاؤ

کلیوں نے بھی کہ دیا کہ جاؤ!

مانگو ہی نہیں تو تم کو کیا دیں

کافی ہیں تمہیں ہماری یادیں

جی میں تھا غبار حسرتوں کا

سینہ تھا مزار حسرتوں کا

گلشن سے صبا کا ایک جھونکا

بیگانہ صفت گزر گیا ہے

ڈھلتی رات

ڈھلتی ہوئی رات کی خموشی
بستی کی فضا پہ چھا گئی ہے
ڈیوٹی ہے طویل سنتری کی
کتوں کو بھی نیند آ گئی ہے

گر جا کی گھڑی نے جھنجنا کر
چپکے سے جو دو بجادیئے ہیں
لوگوں نے گرا لئے ہیں پرے
لوگوں نے دیے بھادیئے ہیں

ہمارا ہوا مارکٹ کا مزدور
 ٹھیلے پہ دراز ہو گیا ہے
 نالے ہی پہ اذگھتا ہے بیٹھا
 پٹری ہی پہ پڑ کے سو گیا ہے

گرٹ تک کی بند ہیں دکانیں
 سینما بھی اُجڑ چکے ہیں سارے
 اکا ہے نہ بس نہ گھوڑا گاڑی
 بوجھل ہیں قدم تھکن کے مارے

کونوں میں دیک گئی ہیں آخر
 پڑوں سے وہ جھانکتی لگا ہیں
 روزن ہیں تمام خالی خالی
 جلوے نہ لگاؤ ہیں نہ آہیں

تاروں کی اُداس اُداس پکیں
 کہتی ہیں انہیں بھی کچھ ہوا ہے
 کیسے بھلا سوئیں آنکھ جھپکیں
 اب چاند جو سر پہ آگیا ہے

ہم سے تو اسے غرض نہ ہوگی
 جانے یہ کسے بلا رہی ہے
 گونجی ہے کہیں پہ کوئی سیٹی
 کس شہر کی ریل جا رہی ہے

سگنل کے دیے کی ایک چمک
 کہتی ہے ہزار ہا کتھائیں
 ہم کو بھی قرار کی طلب ہے
 کس در پہ چلیں، کسے جگائیں

پچھلے پہر کے سناٹے میں

پچھلے پہر کے سناٹے میں
کس کی سسکی کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

زور ہوا کا ٹوٹ چکا ہے
کھلے دریچے کی جالی سے
ننھی ننھی بوندیں چھن کر
سب کونوں میں پھیل گئی ہیں
اور مرے اشکوں سے
اُن کے ہاتھ کا تکیہ بھیگ گیا ہے

کتنی ظالم
کتنی گہری تاریکی ہے
کھلا دریچہ تھر تھر تھر کانپ رہا ہے
بھگی مٹی سوندھی خوشبو چھوڑ رہی ہے
اودے بادل ،

کالے انبر کی جھیلوں میں ڈوب گئے ہیں
کس کے رخساروں کی لرزش دیکھ رہا ہوں
کس کی زلفوں کی شکنوں سے کھیل رہا ہوں
چپکے چپکے لیٹے لیٹے سوچ رہا ہوں
پچھلے پہر کا سنا ہے
کس کی سسکی کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

گھنے درختوں میں پروا کی سیٹی گونجی
دودکشوں میں قیدی روحیں پیچ رہی ہیں

کونوں میں دبے ہوئے جھینگر چلاتے ہیں
 محرابوں سے بھوتوں کے سر ٹکراتے ہیں
 قلعے کے اک برج کے اندر
 ایک پری (شیلٹ کی رانی)
 خندق کے اُن دیکھے پانی کی گہرائی
 اندیشے کے بالشتوں سے ماپ رہی ہے

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلمن
 کھلے دریچے کی جالی سے
 پھن چھن آئیں
 روپ کی جوت حنا کی لالی کل کی یادیں
 سوندھی خوشبو ٹھنڈی بوندیں
 کل کے باسی آنسو جن سے
 فردا کے بالیں کا پردا بھیگ رہا ہے

سحر زدہ مجبوس حبیبہ

سپینوں کے شیلڈ کی رانی
آئینوں میں حُسنِ شکستہ دیکھ رہی ہے
کتنے چہرے ٹوٹے ٹوٹے

پہچانے اُن پہچانے سے
آگے پیچھے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
قلعے کے آسیب کی صورت
کس کی سسکی کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

بچھڑے لوگو پیارے لوگو
چاہیں بھی تو نام تمہارے جان سکیں گے؟
کیسے مانیں تم کو ہمارے
جی لینے کی مر لینے کی
خوشی ہوئی، افسوس ہوا ہے

تم کیا جانو
 کس کے ہاتھ کا تکیہ
 کس کے گرم اشکوں سے بھیگ رہا ہے
 کھلے دریچے کی جالی سے چھٹی آنکھو
 اک لمحے کے کوندے میں تم
 رکن رکن اجنبی چیزوں کو پہچان سکوگی

جیون کھیل میں مارے لوگو
 بچھڑے لوگو پیارے لوگو
 برکھا کی لمبی راتوں میں
 کمرے کی خاموش فضا میں
 پچھلے پہر کے سناٹے میں
 روتے روتے جاگنے والے
 ہم لوگوں کو سو لینے دو
 اور سویرا ہو لینے دو

خزاں کی ایک شام

شام ہوئی پر دیسی پنچپی گھر کو بھاگے
دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے

پت جھڑتو نے کس کس کو حیران کیا ہے؟
”باغ سے پھول اور پھول سے بھونرا چھین لیا ہے“

بھڑیں کیوں کھیتوں کے چکر کاٹ رہی ہیں؟
”بندوں سے اُڑتی مٹی کو چاٹ رہی ہیں“

بچھواتو نے اپنی سوندھی باس گنوائی
”آج سے میں نے اگلی رت کی آس گنوائی“

پودے تو کیوں سوکھ رہا ہے زرد ہوا ہے؟
 ”اس جنگل میں جینے سے جی سرد ہوا ہے“

پسپنوں کی پریوں کے آنچل چوم رہے ہیں
 ہم بھی چپ چپ تنہا تنہا گھوم رہے ہیں

کیسے اُجڑی بستیوں کو آباد کرو گے
 لوگو گل تم ہم لوگوں کو یاد کرو گے

دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے
 شام ہوئی پردیسی پنچھی گھر کو بھاگے

پل سو پل

جس دن کی رہ دیکھی انشا اتنے برسوں آج اور کل
وہ دن آیا بیت گیا من پھر بھی رہا بوجھل بوجھل

پھاگن آئے ساون آئے اس دھرتی کا حال وہی
گدلا انبر، اجڑی کھیتی، پھلوا ری میں چُول نہ پھل

کس کو بتائیں من میں ہمارے مات کے گھاؤ کیسے ہیں
آج کہ اک دُنیا کی نظر میں ایک ہمیں ہم ہیں پاگل

ٹوٹا سا ہس دھندلی بیٹا ریت کے توفے گام بہ گام
وقت کا کوڑا سٹرسٹرسٹریخ رہا ہے پل سو پل



آج تو اپنی ایک ڈگر ہے اپنے سبھی یاروں سے جدا
اپنا جہاں اپنا ہی جہاں ہے یا جادو کا گنگ محل

اس رُت میں تو اور بھی اُجڑی لگتی ہے من کی بگیا
کھلائے سبھی گل بوٹے آشا کی تانینوں کے کمل

باغ نے کتنی کلیاں کھوئیں بستی تک پہنچی خوشبو
آنکھ سے کتنے نیر ہے ہیں دامن تک پہنچا کا جل

عقل نے سودا اور کیا ہے گھاٹا کھا اور مول گنوا
بنجائے اس راہ کو چھوڑ، اے بنجائے اس سینٹھ سے چل

یعنی اس بازار میں دل کو اک انٹی میں بیچ دیا
اس یوسف کے دل کی کاٹنا ہونی تھی اس طور سچل

شہر جنوں سے دشت جنوں تک کتنی مسافت تھی انشا
ایک ہمیں لوٹ آئے ہیں در نہ یار گئے سب دُور نکل

سرتے

نگر پرایا، چیت مہینا، سوئی رات، سرتے
دیواروں پر میلے میلے پھیلے پھیلے سرتے
آنے والی کل کا پھلاوا لپک جھپک دکھلائے
کیا کیا سو انگ رچلے

گھڑی کی سوئی، صدیاں بیت چکیں تو ایک بجائے
آس کی بیل نہایت نربل چھایا سے شرمائے
اندھا دیکھ متوالی پروا کے تھیرے کھائے
کانپ کانپ رہ جائے

پھر زہری بمبارِ فضا پر جھپٹے اور غرائے
 پورب دیس دھوئیں کا بادل اُگ پڑا برسائے
 پچھم کے گدھوں کے شکر آئے پرے جامے
 لاشوں پر منڈلائے

کبھی عقاب، کبھی سونٹیکا اک آئے اک جامے
 جنگ کا نوکا گھر کھیتی کھیاں پڑا جھلسائے
 کہیں تو بے رُت، ہولی کھلے کہیں بنت منائے
 روپ انوپ دکھائے

کال کے کالے کالے راتھس چار کوٹ میں چھائے
 انٹریوں میں بھوک کی کرچیں جہاں تہاں ہر جائے
 گوداموں پر خونی پہرے کھڑے سے کھوا ملائے
 سنگینیں چمکائے

شہر کا قاضی فوتے چھاپے، گلی گلی پھیلائے
 موٹر موٹر پر دکھیا گوری یاد کے دیپ جلائے
 سوچ رہی ہے اتنے دن میں کتنے پاپ کمائے
 کس کو گنتی آئے

— راکشس (شیطان)

ہم جاگیرِ تسلیم کی لے کر کیا کھوئے کیا پائے
 شبِ دمنوہر، بول کٹیلے، رزمزین اور کنائے
 سب غزلوں کے کہنے والے کو یوں نے اپنائے
 اپنے ہاتھ نہ آئے

پیت کی میٹھی باتیں چھوڑیں پھوڑیں اور پختائے
 دھرتی کے بیٹوں کی بیٹاؤں کے آٹھے گائے
 چوروں کی مانند بندھی مشکوں میں پکڑے آئے
 دیوانے کہلائے

یاروں کا اک غول چھنا چھن جیسوں کو چھکا گئے
 ان لوگوں نے چاکریوں میں سستے ٹکے کما گئے
 انشا جیسے ایک باد بٹھکے تو بوٹے پر آئے
 کوئی نہ دھوکا کھائے

نگر پرایا، چیت مہینا، سونی رات، سرائے
 دیواروں پر میلے میلے پھیلے پھیلے سائے
 آنے والی کل کا بھروسہ دن دن اٹھتا جائے

یارو کوئی اپائے !

یارو کوئی اپائے !!

رنجشہ

بڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان رنجشوں کو لوگ



دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دُویا ایک ہزار کے بیچ
انشا جی کیا مال لے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ
پینا پلانا عین گنہ ہے ، جی کا لگانا عین ہو س
آپ کی باتیں سب سچی ہیں لیکن بھری بہار کے بیچ
اے سخیو اے خوش نظر و یک گو نہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھر میں ہیں صبح سے شہر نگار کے بیچ
خار و خس و خاشاک تو جانیں ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گلِ خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ
منتِ قاصد کون اٹھائے شکوہ درباں کون کرے
نامہ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

لوگ ہلالِ شام سے بڑھ کر پل میں ماہِ تمام ہوئے
 ہم ہر برج میں گھٹتے گھٹتے صبح تک گننام ہوئے
 اُن لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے
 نجد میں قیس یہاں پر انشا خوار ہوئے ناکام ہوئے
 کس کا چمکتا چہرہ لائیں کس سوج سے مانگیں دھوپ
 گھوڑا نہ دھیرا چھا جاتا ہے خلوتِ دل میں شام ہوئے
 ایک سے ایک جنوں کا مارا اس بستی میں رہتا ہے
 ایک ہمیں ہشیار تھے یارو ایک ہمیں بدنام ہوئے
 شوق کی آگ نفس کی گرمی گھٹتے گھٹتے سرد نہ ہوئے
 چاہ کی راہ دکھا کر تم تو وقفِ دیبچہ و بام ہوئے
 اُن سے بہار و باغ کی باتیں کر کے جی کو دکھانا کیا
 جن کو ایک زمانہ گزرا گنجِ قفس میں رام ہوئے
 انشا صاحب پو پھنتی ہے نارے ڈوبے صبح ہوئی
 بات تمہاری مان کے ہم تو شب بھر بے آرام ہوئے

غزل

(حرف بازتاں گفتن)

ہم رات بہت رُئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بو بھل ہو تو پھر نیند کہاں کی

سر زانو پر رکھے ہوئے کیا سوچ رہی ہو
کچھ بات سمجھتی ہو محبت زدگاں کی؟

قم میری طرف دیکھ کے چپ ہو سی گئی تھیں
وہ ساعتِ خوش وقت نشاطِ گزراں کی

اک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایاںِ تمنا
اک رات ہے مہتاب کے ایامِ جواں کی

اب اور ہی اوقات ہے اے جانِ تمنا
ہم نالہ کتابِ بے گنہاں، غم زدگاں کی

اس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے ہوئے تارو
کہتے ہو کبھی بات دہاں جا کے یہاں کی؟

برگشتہ ہوا ہم سے یہ مہتاب تو پیارو
بس بات سُنی راہ چلا کاہتہاں کی

اللہ کرے میر کا جنت میں مکاں ہو
مرحوم نے ہر بات ہماری ہی بیاں کی

ق

پڑھتے ہیں شبِ روز اسی شخص کی غزلیں
غزلیں کہ حکایات ہیں ہم دل زدگاں کی

تم چرخِ چہارم کے ستارے ہوئے لوگو
تاراج کرو زندگیاں اہل جہاں کی

ق

اچھا ہمیں بنتے ہوئے مٹتے ہوئے دیکھو
بہم موجِ گریزاں ہی یہی آبِ رواں کی

انشا سے ملو اس سے نہ روکیں گے، لیکن
 اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی؟

مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
 باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

اے دوستو اے دوستو اے درد نصیبو!
 گلیوں میں چلو سیر کریں شہرِ بنگاں کی

ہم جائیں کسی سمت کسی چوک پہ ٹھہریں
 کہیو نہ کوئی بات کسی سودو زیاں کی

انشا کی غزل سن لو پہ رنجور نہ ہونا
 دیوانہ ہے دیوانے نے اک بات بیاں کی

ہوتا ہے یہی عشق میں ہنجار سبھی کا
 باتیں یہی دیکھی ہیں محبت زدگان کی



اور تو کوئی بس نہ چلے گا بھر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دو بھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سوئے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

جس جیسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میل لگا نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو ، دل کا کہنا ، وضع نہ جاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشائی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا



پیت کے روگی سب کچھ بوجھ سب کچھ جانے ہوتے ہیں
ان لوگوں کے اینٹ نہ مارو کہاں دوانے ہوتے ہیں؟

آئیں ان کی اُڈتے بادل آنسو ان کے ابرِ طیر
دشت میں ان کو باغ لگانے شہر بسانے ہوتے ہیں

ہم نہ کہیں گے آپ ہیں پیت کے دشمن من کے کھٹور مگر
اُٹھنے کے ناٹھنے کے لاکھ بھانے ہوتے ہیں

اپنے سے پہلے دشت میں رہتے کوہ سے نہریں لاتے تھے؟
ہم نے بھی عشق کیا ہے لوگوں سب افسانے ہوتے ہیں

انشا جی چھبیس برس کے ہو کے یہ باتیں کرتے ہو؟
انشا جی اس عمر کے لوگ تو بڑے سیانے ہوتے ہیں



خوب ہمارا ساتھ نبھایا، بیچ بھنور کے چھوڑا بات
ہم کوڈ بو کر خود ساحل پر جانکے ہو۔ اچھی بات

شام سے لے کر پو پھٹنے تک کتنی ریتیں بدلتی ہیں
آس کی کلیاں یاس کی پت جھڑ صبح کے شکوں کی برسات

اپنا کام تو سمجھنا ہے اے دل رشتے جوڑ کہ توڑ
بھر کی راتیں لاکھوں کروڑوں وصل کے لمحے پانچ کہ سات

ہم سے ہمارا عشق نہ چھینو، حسن کی ہم کو بھیکنے دو
تم لوگوں کے دور ٹھکانے ہم لوگوں کی کیا اوقات

روگ تمہارا اولیٰ ہے انشا، بیدوں سے کیوں چہل کرو
درد کے سوئے کرنے والے درد سے پا سکتے ہیں نجات؟



اُن کا دعویٰ . اُن کی عدالت اور انہی کی تعزیرات
اُن کا دوست زمانہ سارا . اپنا دوست خدا کی ذات

اے یارو اس فصل میں اپنا جوشِ جنوں سُوانہ کرو
گلشن گلشن خاک اُڑتی ہے پھول نہ غنچے ڈال نہ پات

نہر و مرفت میں وہ ہمارے پتھر کے بُت اچھے تھے
اُٹے تھے اب لوٹ چلے ہیں حضرت یزداں تسلیمات

آپ ہی آپ پٹے جاتے ہیں اپنے پیادے اپنے قیل
ہم کیوں کھیلیں اس بازی میں ہاتھ ہمارے جیت نہ تات

ہم نے یہ مانا اک آنٹی میں یوسفِ کنعان ملتا ہے
وقت کے بوسین چرخے پر اُمیدوں کا سوت نہ کات

انشا صاحب صبح ہوئی ہے اٹھو بھی اب کوچ کرو
اس منزل پر قافلے والے رکتے ہیں بس رات کی رات



ساون بھادوں ساٹھ مہی دن میں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی کسی برسات کہاں

چاند نے کیا کیا منزل کر لی۔ نکلا۔ چمکا ڈوب گیا
بہم جو آنکھ جھپک لیں سو لیں اے دل بہم کورات کہاں

پیت کا کاروبار بہت ہے اب تو اور بھی پھیل چلا
اور جو کام بہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

قیس کا نام سُنا ہی ہوگا بہم سے بھی ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں



ہم اُن سے اگر مل بیٹھتے ہیں کیا دوش ہمارا ہوتا ہے
کچھ اپنی جسارت ہوتی ہے کچھ اُن کا اشارا ہوتا ہے

کٹنے لگیں راتیں آنکھوں میں دیکھا نہیں پکوں پر اثر ہے
یا شامِ غریباں کا جگنو، یا صبح کا تارا ہوتا ہے

ہم دل کو لئے ہر دیں پھرنے اس جس کے گاہک مل نہ سکے
اے بنجارو ہم لوگ چلے، ہم کو تو خسارا ہوتا ہے

دُقر سے اٹھے کیفے میں گئے کچھ شعر کہنے کچھ کافی پی
پوچھو جو معاش کا انشا جی یوں اپنا گزارا ہوتا ہے



زمیں پہ سبزہ لہک رہا ہے فلک پہ بادِ دھواں دھواں ہے
مگر جو دل کے مزاج پوچھو ہمارے دل کا عجب سماں ہے

درون سینہ غم جدائی کا داغ ہے اور کہاں کہاں ہے
اگر یہی بختِ عاشقاں ہے فغاں ہے اے دوستو فغاں ہے

خراب دل کی خراب باتیں اُداس دن بے قرار راتیں
جو درد ہے دردِ جانتاں ہے جو سوز ہے سوزِ رائیگاں ہے

میں تیری مانندِ سعتِ بہر میں اکیلا سا پھر رہا ہوں
فضائے صحرا کے ابر پارے کہیں پہ منزل کا بھنٹاں ہے

نہ قافلہ چاند کا ہویدا ، نہ منزلِ نورِ صبح پیدا
وہی گزرگاہِ کہکشاں ہے ، وہی غبارِ ستارگاہ ہے

نہ ایسے آنے کی آرزو تھی نہ ایسے جانا ہماری نحو تھی
ہمارے دل کی بھی آبرو تھی مگر وہ پہلا سادل کہاں ہے

تم اس پہ حیراں ہو خوش خیالو ، پُرانے وقتوں کے نجد الو
وگر نہ ہم کو بھی کچھ گماں ہے ، وگر نہ اپنی بھی داستاں ہے

نہ ان کے چہرے کی دھوپ لکھی نہ ان کے آنچل کی چھاؤں پانی
رتوں سے محروم جا رہے ہیں عجب نصیبِ بلاکشاں ہے

تم اپنے انشا کی راہ و منزل کو جانتے ہو پھر اس سے مطلب
وہ تنہا تنہا رواں دواں ہے کہ ہمراہِ اہل کارواں ہے



سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے مری جاں کوئی؟
ایسے دامن سے ملاتا ہے گریباں کوئی؟

قیس صاحب کا تو اس غم میں عجب حال ہوا
اپنے رستے میں نہ پڑتا ہو بیاباں کوئی

ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا ہوتا
آہی نکلے اگر آنسو شہرِ مژگاں کوئی؟

یارو اس دروِ محبت کی دوا بتلاؤ
ڈھونڈ لیں گے غمِ دوراں کا تو درماں کوئی

یک نظر دیکھنا، رم کرنا، ہوا ہو جانا
اُن سے چھوٹی ہے بھلا خوںِ غزالاں کوئی؟

ہم کسی سمت بھی نکلے ہوں وہیں جانکیں
ہم سے بھولی ہے رہ کو چہ جاناں کوئی؟

’ب تری یاد میں روئیں گے نہ حیراں مٹیں گے‘
’اُن سے پچھیں ہے کوئی‘ دل سے پچھیں کوئی

سوئی راتوں میں سر بسترِ خوابِ احت
بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

بھگی شاموں میں کھلے صحن میں تنہا تنہا
بیقرارانہ ہی دیکھا ہے خراماں کوئی

دوستو دوستو اس شخص کو جا کر سمجھاؤ
اپنے انشا کے سنہلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی بسم لوگوں کی وحشت پہ نہا کرتا تھا
آیا اس خانہ ویراں میں بھی مہماں کوئی



یوں تو ہے وحشت جزو طبیعت، بظاہر انہیں کم لوگوں سے
اب تو برس دن بعد بھی انشائے نہیں ہم لوگوں سے

کیوں تجھے ضد ہے وضعِ نبھائیں، چاند نہ دیکھیں عینِ کیوں
چھپنے کے گا اے دلِ بریاں دیدہ پر ہم لوگوں سے

کیا ہوا خشت اٹھا دے ماری یا سرد امنِ نوحِ لیا
تم تو دروانے اس کے بہانے ہو چلے برہم لوگوں سے

عشق کریں تو جنوں کی تہمت، دور رہیں تو تونما راض
اب یہ بتا ہم تجھ سے نبھائیں یا دلِ محرم لوگوں سے



ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں

ہم سے بھی پیت کی بات کرو کچھ ہم سے بھی لوگو پیار کرو
تم تو پشیمان ہو بھی سکو گے ہم کو یہاں پہ دوام کہاں

سانجھ کے کچھ تارے نکلے پل بھر چکے ڈوب گئے
انہر انہر ڈھونڈ رہا ہے اب انہیں ماہِ تمام کہاں

دل پہ جو بیتے سہ لیتے ہیں اپنی زباں میں کہہ لیتے ہیں
اشفاق جی ہم لوگ کہاں اور تیر کا رنگِ کلام کہاں

ہمیں تم پہ گمانِ وحشت تھا ہم لوگوں کو رسوا کیا تم نے
 ابھی فصل گلوں کی نہیں گزری، کیوں مہن چاک سیا تم نے
 اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی، بڑا مان کریں ریشٹوں کا
 پر تم سے تو اتنے برس ہم ہیں کیا ان کے مانگ یہاں تم نے
 کن راہوں سے ہو کر آئی ہو، کس گھل کا سندیسہ لائی ہو
 ہم باغ میں خوش خوش بیٹھے تھے کیا کر دیا آکے صبا نے
 غم عشق میں کلامی دوانہ دعا، یہ ہے روگ کٹھن یہ ہے دردِ بُرا
 ہم کرتے جو اپنے سے ہو سکتا، کبھی ہم سے بھی کچھ نہ کہا تم نے
 وہ جو قیس غریب تھے ان کا جنوں بھی کہتے ہیں تم سے بابے فزوں
 ہمیں دیکھ کے منس تو دیا تم نے کبھی دیکھے ہیں ابل و فاقم نے؟
 اب ہر و ماندہ سے کچھ نہ کہو، یوں نہیں شاد رہو آباد رہو
 بڑی دیسے یاد کیا تم نے، بڑی دُور سے دی ہے صدا تم نے
 اک بات کہیں گے انشا جی تمہیں ریختہ کہتے عمر بنوئی
 تم ایک جہان کا علم پڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے؟



جنگل جنگل شوق سے گھومو دشت کی سیر مدام کرو
انشا جی ہم پاس بھی لیکن رات کی رات قیام کرو

اشکوں سے اپنے دل کی حکایت دامن پر ارقام کرو
عشق میں جب یہی کام ہے یار و لے کے خدا کا نام کرو

کب سے کھڑے ہیں بریں خراجِ عشق لئے سر راہ گزار
ایک نظر سے سادہ رنجو ہم سادہ دلوں کو غلام کرو

دل کی متاع تو ٹوٹ رہے ہو جن کی دی بے نزاکت کبھی؟
روزِ حساب قریب ہے لوگو کچھ تو ثواب کا کام کرو

میر سے بیعت کی ہے تو انشا میر کی تبعیت بھی ہے ضرور
شام کو رو رو صبح کرو اب، صبح کو رو رو شام کرو



دل کس کے تصور میں جانے راتوں کو پریشاں ہوتا ہے
یہ سخن طلب کی بات نہیں، ہوتا ہے مری جاں ہوتا ہے

بہم تیری سکھائی منطق سے اپنے کو تو سمجھا لیتے ہیں
راک خار کھٹکتا رہتا ہے سینے میں جو پنہاں ہوتا ہے

پھران کی گلی میں پہنچے گا، پھر سہو کا سجدہ کرے گا
اس دل پہ بھروسہ کون کرے، ہر روز مسماں ہوتا ہے

وہ درد کہ اس نے چھین لیا، وہ درد کہ اس کی بخشش تھا
تنہائی کی راتوں میں انشب اب بھی مرا مہماں ہوتا ہے

دل کا تھا چاک مگر پہنچایا، تا بہ گریباں نشانے
 دشت میں جا کہ شہر بسایا بے سرو سامان نشانے
 قیس کی سنت نجد و فامیں پھر اس شخص نے زندہ کی
 ہم کو بھی پہلے قیس نہیں آیا انشانے ہاں نشانے
 پھر کوئی یاد پرانی جاگی، پھر کسی درونے چٹکی لی
 پھر ہمیں دیوانے نے بلایا چلتے ہیں یاراں (انشانے)
 ایک سے ایک انوکھا تیکھا دنیا میں غم تو ہزاروں تھے
 کیوں تجھے تنہا جی میں بسایا اے غم جاناں انشانے
 اہلاً و سہلاً تیسے حلو میں آتا ہے جو کچھ آنے دے
 عشق کو ہے اب ڈھال بنایا گردشِ دوراں انشانے
 دل کے سمجھنے کی کوئی صورت لازم بنے یہاں کچھ بھی نہیں
 اپنے کو جسے یہ روگ لگایا کر لیا حیراں انشانے
 اب اسے دنیا وحشی ورسوا خوار و پریشاں کچھ بھی کہے
 عشق کیا اور کر کے نبھایا عشق کے شایاں انشانے



پریت کرنا تو ہم سے نہ جانا سجن، ہم نے پہلے ہی دن تھا کہانا سجن
تم ہی مجبور ہو، ہم ہی مختار ہیں، خیر مانا سجن یہ بھی مانا سجن

اب جو ہونے کے قصے سبھی ہو چکے، تم ہمیں کھو چکے تم ہمیں کھو چکے
آگے دل کی نہ باتوں میں آنا سجن کہ یہ دل بے سدا کا دوانا سجن

یہ بھی سچ ہے نہ کچھ بات جی کی بنی، سونی راتوں میں دیکھا کئے چاندنی
پر یہ سودا ہے ہم کو پرانا سجن، اور جینے کا اپنے بہانا سجن؟

شہر کے لوگ اچھے ہیں ہمدرد ہیں، پر ہماری سنو ہم جہاں گرد ہیں
داغ دل نہ کسی کو دکھانا سجن، یہ زمانا نہیں وہ زمانا سجن

اس کو مدت ہوئی صبر کرتے ہوئے، آج کوئے و فاسے گزرتے ہوئے
پوچھ کر اس گدا کا ٹھکانا سجن، اپنے انشا کو بھی دیکھ آنا سجن



کبھی ان کے من کی آشنائے اک حوت جگاد می مٹی من میں
اب من کا اُجالا سنا لایا ، پھر شام ہے من کے آنگن میں

جی گھٹا ہے آنسو ڈھلتے ہیں ہر سیر میں دیسکا جلتے ہیں
اس برکھا سے جی کی آگ بجھے یہ تو اور بھی بھڑکے ساون میں

چلو آتشا کے پاس چلیں مٹھیں سنیں گیت منو ہر پریم بھرے
جنہیں سن لیں تو من کو موس مریں سبھی گوچیاں گوکل کے بن میں

یہ پھیل چھبیل کون پھرے اس مہترا کی نگر می میں سکھیو
سبھی باتیں کہ اپنے شیا م میں تھیں اب دیکھ لو اس منو ہن میں

- آشا - اُفیدہ + منموہن - دل پسند

بھی بول مھر بھی نین بھل ، کن گلیوں میں تم ہمیں لے آئے
اس من کو نہ لوگو بھٹکاؤ ، یہ من ہے کسی کے بندھن میں

ہر شکل کا روپ نہیں ہوتا ، ہر روپ کو نام نہیں دیتے
کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں ، کچھ روپ ہیں من کے دین میں

کبھی من کے اجنتا میں آؤ ، وہ صورتیں تم کو دکھلائیں ،
وہ صورتیں تم کو دکھلائیں ، ہم کھو گئے جن کے دشن میں

ہر ایک پہ نظریں اٹھنی تھیں ، ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا
اس شہر میں روپ کا کال نہیں کچھ اور ہے اپنے ساتھ میں

یابن میں چکارے ملتے ہیں ، یاپیت کے مارے ملتے ہیں
کچھ پرب میں ، کچھ پچھم میں ، کچھ اتر میں ، کچھ دکھن میں

شہروں میں پھرے سنیاں لے جنتا کو جگت بھگوان کہے
انشا سا کوئی رتنا دیکھا؟ کہنے کو ہیں جوگی ہسربن میں

سنیاں - فقیری + جگت - دنیا

کس واسطے ٹھیسٹ بنے رہیئے، ذرا رنگ بدلی کے غزل کہنے
یہ جوار و زبان ہماری ہے سوزِ نگ میں اس کے امن میں

اُس حُسن کے نام پر یاد آئے سب منظرِ فیض کی نظموں کے
وہی رنگِ حنا، وہی بندِ قبا، وہی پھول کھلے پر امن میں

کچھ وہ جنہیں سہم سے نسبت تھی ان کو چوں میں آنِ بادِ ہرٹے
کچھ عرش پر تارے کہلائے، کچھ پھول بنے جگمگ میں

ہم لوگوں کے آنے سے پہلے بھی تم لوگ ادھر سے گزرتے تھے
کبھی پھول بھی دیکھے غزفوں میں، کبھی قوسِ قزح کسی چمن میں؟

یوں کرنے کو عشق پر قید نہیں سب کہتے ہیں اچھا کرتے ہیں
پرہم سے بہت بھی نہیں گزرے۔ کچھ لوگ تھے مضرِ امن میں

ہم ان سے جو مل کر دُور ہوئے، کچھ خوش ہوئے، کچھ رنجور ہوئے
اب دل کا ٹھکانا مشکل ہے ہاں جانِ سبے کی امن میں

تم لوگوں نے چاند بچھا ڈالا، شبِ رامہ کا لطف گنوا ڈالا
 اب لاکھ چراغ جلاتے پھرو، ہر راستے پر ہر روزن میں
 کبھی میرِ فقیر کی بیتیوں سے، کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی
 اِن پردہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

پردہ - علی گئی، اکیلہ پن

طویل نظمیں

بغداد کی ایک رات

سند باد آج تو ہمراہ مجھے بھی لے چل
دل جو پہلا تو خیالوں ہی میں اپنا پہلا
میں ترے ساتھ زمانے کی نظر سے ادھل
لے کے چلتا ہوں خیالوں کا سینہ اپنا
بماہی نکلیں گے کسی شہر میں ہسم آج نکل

شور و غل شہر کا مہم ہوا، پھر ڈوب گیا
آج بستی سے بہت دُور نکل آیا ہوں
ظلمتِ شام نے دُھندلا دیے دشت و دریا
سوچتا ہوں کہ سرائے کو ابھی لوٹ چلوں

یا اسی ساحتِ ویراں کے کسی گوشے میں
سرد بالو کو بنائے ہوئے بستر اپنا
آج کی رات گزاروں کہیں بیٹھے بیٹھے
شہر و صحرا میں مسافر کے لیے فرق ہی کیا؟



خواب آلود ہے دجلہ کے سوا حل کا جہاں
پھیلے جاتے ہیں پُر اسرار دُھند لکے ہر سو
خنکیاں وسعتِ صحرا میں ہوئیں بالِ فشاں
سوندھی سوندھی سی یہ آتی ہے کہاں سے خوشبو

سطحِ دجلہ پہ گفہ کوئی محیلہ کوئی
شام کی دُھند میں لپٹا ہوا ہولے ہولے
شہر کی سمت بڑھا جاتا ہے لیکن چپ چاپ
جیسے خاموشی، صحرا سے اُکھننے سے ڈرے

پرلے ساحل پہ مچھیروں کی کسی بستی میں
جاگتے جاتے ہیں مٹی کے تنک تاب دیے
کوئی دم جاگ کے تھک جائیں گے سو جائیں گے
کون اس رات کو پایاں سحر تک پہنچائے

۱؎ گفہ یا تھ ایک گول کشتی ہے جو ہزاروں برس سے دجلہ میں چلتی آئی ہے۔
محیلہ لمبی اور نوکیلی ہوتی ہے۔

زرد رُو چاند تھکے ہارے مسافر کی طرح
 منزلِ دُور کی راہوں کے تصور سے اُداس
 مطلعِ شرق سے ابھرا ہے پریشاں حیراں
 دشتِ ویراں میں کھجوروں کے کسی جھنڈ کے پاس

اور کسی مرقدِ شکستہ کے گنبد میں کہیں
 دوش و امروز کی گردش کا ستایا ہوا بوم
 آلِ برمک بنی عباس کے نوے گاتا
 یک بیک کس لیے چُپ ہو گیا، کس کو معلوم

اک عجب کیفیتِ خوابِ مستط ہے ~~مطلوع~~
 شورِ ماتم ہے کسی سمت نہ شادی کا فروش
 اپنی دنیاے کشاکش کو میسر ہیں کہاں
 نعلِ شام میں بھیکے ہوئے لمحاتِ خموش

دن مشقت میں کٹیں ، راتیں ستارے گنتے
 صبحیں آئیں غم تازہ کے سندیسے لے کر
 رُوح بے مہرِی اوقات کا محور ہی ہے
 جانے کب تک ہے یہی سلسلہ شام و سحر

شاہزادوں ہی کی جاگیر ہیں سارے انعام
 اپنی قسمت ہے فقط خار کشتی، محرومی
 کچھ اسی دور میں دیکھا ہے یہ رنگِ ایام
 زندگی پہلے زمانوں میں تو دشوار نہ تھی



ہاتے کیا دن تھے ، میسر تھا ہر انسان کو فراغ
 لوگ باشوکت شاہانہ جیا کرتے تھے
 سب کی جیبوں میں ہوا کرتے تھے جادو کے چراغ
 جن سبھی کام سرانجام دیا کرتے تھے

حکم ملتے ہی بنا دیتے تھے بگڑی ہوئی بات
 عیش جاوید میں آنے نہیں پاتا تھا خلل
 لاکے پہلو میں بچھا دیتے تھے محبوب کی سچ
 رات کی رات میں چن دیتے تھے مرم کے محل

خضر و الیاس خلاؤں سے ٹپکتے تھے
 آیا کرتا تھا کڑا وقت کسی پر جو کبھی
 جی میں آئی تو ہوئے دیدہ حیراں سے الوپ
 سیر کی شہیرِ شہ رخ پہ زمانے بھر کی

پیٹ بھوکا تھا کوئی اور نہ برہنہ کوئی جسم
 کس کو مزدوری و محنت کی پریشانی تھی
 قاضی ایں ہمہ حاجات تھا سم سم کا طلسم
 باہر آورد خزانوں کی سرادانی تھی

ہم نے دیکھا ہے پھیروں نے جو ڈالا کبھی حال
 دجلہ سے عہدِ سلیمان کے خزینے نکلے
 اپنی تقدیر پہ کورا نہ بھروسے کے طفیل
 کتنے حُبالِ سربامِ امارت پہنچے

دیکھتے دیکھتے ان لکڑہاروں کا
 شوکت و شانِ وزارت میں بدل جاتا تھا
 اہم اعظم کی کرامت تھی جہانگیر ایسی
 سایہ ادا کا اک آن میں ٹل جاتا تھا

شہر میں آئے گجر دم جو مسافر کوٹی
 لوگ اسے شہر کا سلطان بنا لیتے تھے
 تاج رکھتے تھے سرفرق بصد عجز و نیاز
 اپنا آفتابہ دل و جان بنا لیتے تھے

۱۔ حسنِ جبال (حسنِ رسن ساز) کا قصہ الف لیلہ کے مشہور قصوں میں سے ہے۔ اس کی ایک
 پیڑی کی پونجی محض خوبی طالع سے لاکھوں میں بدل جاتی ہے۔

بادشہ زادیاں قدموں میں بجھی رہتی تھیں
 دور از دست نہ تھے قاف کی حُوروں کے پرے
 اپنے محلوں میں چھپا لیتی تھیں لا کر پریاں
 ابنِ آدم جو اکیلے میں کہیں مل جائے

اپنا یہ عالم بے رنگ بھی عالم ہے کوئی؛
 آؤ کچھ دیر انہی خوابوں کے جزیروں میں چلیں
 ڈھونڈیں بغدادِ کہن سال کی گلیوں میں سکوں
 ارضِ افسانہ پہ جادو کے کھٹولے میں اڑیں

کتنی شب بیت گئی جسد کی ساکن موج
 آدھی بجتی ہے کہ ہے پچھلے پہر کا ہنگام
 کشتِ انجم سے گزرتا ہوا مغرب کی طرف
 منزلیں طے کیے جاتا ہے مہِ سُستِ خرام

چادرِ خواب میں لپٹا ہے جہانِ موجود
 الف لیلہ کے فسانوں کا جہاں ہے آباد
 شہرِ رومان کے ہنگاموں کا عالم ہے وہی
 پھر وہی شورِ سلائی ہے بسوق و بازار

پھر انہی زندوں کے جھرمٹ ہیں خراباں کے گرد
کہنہ محروں میں کھنکتے ہیں دہی جام و سُبُو
قصرِ شاہی کے جھروکوں میں پریشاں ہیں ادھر
ماہِ رخسار کسبزیوں کے گھنیرے گیسُو

شوِ نغمہ ہے زبید کے شبستاں میں بند
عود و عنبر کا تعطر ہے فضا میں ساری
سُونے ایوانوں میں پائل کے چھناکے گونجے
چھم چھا چھم ، چھا چھم ، رقص ہوا ہے جاری

لو کوئی غیرتِ ناہید قیامت بردوش
اپنا سرمایہٴ اعجاز سمیٹے آئی
(ساز بیدار ہوئے جھانچھ نے پہلو بدلے)
اور مغنی نے غزل دھیمے سُردوں میں چھیڑی

غ

اے دل اندیشہ آلام نہ کر آج کی رات
 آن کی چٹون کے اشارے ہیں ادھر آج کی رات
 دیکھنا ہے شبِ عشرت کی نہایت کیا ہے
 بزمِ اٹھتی ہے کہ ہوتی ہے سحر آج کی رات
 ایسے عالم میں قیامت کا نہ چھیڑو مذکور
 قدرِ ایمان سمجھتے ہیں مگر آج کی رات
 زاہد و جامِ پیو ، حسد کی حسرت چھوڑو
 ساقیو ان پہ بھی احساں کی نظر آج کی رات
 دل کو برماؤ ستاروں پہ کمندیں ڈالو
 رقصِ فرماؤ باندازِ دگر آج کی رات

رُک گئی گیت کی لے ، تھم گئی پائل کی چھنک
 رقصِ پیمانہ و مینا کی ہوئی تیاری
 اک طرف غرقِ مے ناب ہوئے ظلِ اللہ
 مایہ ہوشِ ادھر ہا ر گئے درباری



اور ڈیوڑھی پہ کھڑا ایک غلام زنگی،
اپنی دنیا ئے تصور میں کہیں کھویا گیا
آہیں بھرتے لگا اُڈے ہوئے آنسو روکے
بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانے کیا یاد آیا

اس کے خوابوں کی سیہ چہرہ پری رہتی ہے
ارضِ تاریک حبش کی کسی وادی میں کہیں
اڑ کے جائے اسے سینے سے لگالے لیکن
آج اک جنسِ تجارت ہے یہ انساں تو نہیں



یہ بھی دنیا ہے وہی، آؤ کہیں اور چلیں،
آنے تھے ہم تو اسی درد سے ڈرتے بچتے
سکیاں گیت کی لے سے ہیں گلوگیر یہاں
گرم اشکول میں شرابور ہیں رونا چہرے



کون بیٹھا ہے وہ دیکھیں تو سرِ راہ گزر
 ہے اسی شہر کا باسی کہ مسافر کوئی
 اپنے وعدے کو نبھائے گی کوئی ہرنگار
 کس کی رہ دیکھ رہا ہے ذرا پوچھیں تو یہی

ابوالحسن نام کا اپنا یہ وہی دوست نہ ہو
 آنکلتا تھا جو ہر شام سرِ راہ گزار
 جستجو دل میں کسی اجنبی مہماں کی لیے
 اس کی یہ وضع معین تھی خزاں ہو کہ بہار

بھیس میں تاجِ سرِ موصل کے خلیفہ ہارون
 ایک شب اس کے شبستاں میں جو آکر ٹھہرا
 کھا کے یک روزہ خلافت کا فریبِ سیمیں
 یہ بچار کسی مجلس میں نطنز آیا بھتا



دیکھنا ظِلِّ الٰہی کی سواری آئی
 راستہ چھوڑو کہ سلطانِ جہاں آتے ہیں
 ساتھ شکر ہے ندیموں کا خراماں بادب
 سر پہ طاؤس دُہما سایہ کناں آتے ہیں

دھول مٹی میں سنے کیڑو مکوڑو رستہ
 بندگی پیشہ غلاموں کے گرد ہو چھٹ جاؤ
 اپنی منخوس جبینوں کو چھپالو فوراً
 شاہِ دوراں کی نگاہوں سے پرے ہٹ جاؤ



دور وادی میں نظر آتی ہے اونچے اونچے
 سبز پریوں کے محلات کی دُھندلی سی قطار
 آؤ کچھ دیر وہیں چل کے ذرا ستالیں
 کچھ تو ہو حاطرِ درماندہ کو ساماںِ قرار

شہرِ مسحور نہ پڑتا ہو مگر رستے میں
 جس کے بازار ہیں خاموش بہائم سے پٹے
 ایک دن یہ سبھی انسان تھے مگر آج نہیں
 کس میں ہمت ہے کہ اس سحرِ گراں کو توڑے



کتنے مہ پاروں کے جھرمٹ ہیں حرم کی دلق
 بجتے ہیں چاند سے جسموں پہ مرقع گہنے
 جمع ہیں خدمتِ اتدس میں نوادر کیا کیا
 فطرتِ سبحانی کی سطوت کے تو پھر کیا کہنے

چرخِ کس کی یہ سرِ بامِ فلک جا پہنچی
 کون برسوں کی تمتا سے لپٹ کر رویا
 پہلے شاہیں کس کس کا جگر گوشہ ہے
 کتنی کٹیاں ہیں اُجڑ کر حرم آباد ہوا

درد خوابیدہ کی ٹیسیں بھی تو جاگ اُٹھتی ہیں
 عشرتِ رُوح کا سماں نظر آتا ہے جہاں
 ایک کانٹا بھی تو چُپھ جاتا ہے چپکے سے کہیں
 پھول نہکت بگریباں نظر آتا ہے جہاں

شہرِ رُومان پہ چھایا ہے وہی رنگِ ملال
 جس سے انساں کو مفرِ عالم امکاں میں نہیں
 سند باد آئے، مگر سختی طوفاں کے ستائے
 تسمہ پاؤں کی اسیری میں دل انکارِ وغمیں



کس کی محفل میں یہ لے آئی ہے اب کے افتاد
 بزمِ ہاروں تو نہیں حاجبِ دل سے پوچھیں
 ہر کوئی اٹھ کے سُناتا ہے کہانی اپنی
 ہم بھی اس حلقے میں چل کے ذرا بیٹھیں دیکھیں

”ظَلَّ سُبْحَانِي تَرَا مَرْتَبَهُ فَتَأَمَّمْ دَائِمًا“
 تجھ کو اللہ سلیمان کا منصب بخشے
 میں بھی اس شہر کے بازاروں میں نووارد ہوں
 میری باری ہے تو میری بھی حکایت سن لے

میں کسی شہر کا تاجر ہوں نہ والی نہ وزیر
 نہ کسی شاہِ معاصر کا جگر گوشہ ہوں
 نہ کسی بادشاہِ زادی کی محبت کا اسیر
 سر میں سودائے ریاست ، نہ امارت کا جنوں

میں ہوں دہقان جو کھیتوں میں اگاتا ہے اناج
 فصل پکنے پہ سمجھتا ہے کہ محنت برائی
 یہ مگر تیرا ، کہیں تیرے پیادوں کا خراج
 میں جو کھیان سے دامن لیے بھڑٹا خالی

آج مزدور ہوں اک تیل کے بل کا مزدور
 اور اس جہدِ شب و روز سے پایا کیا ہے
 خود تہی دست ہوں، خواجہ کے خزانے بھر پور
 اب میں یہ پوچھنے آیا ہوں۔ یہ دنیا کیا ہے؟

کیا مجھے پرچم کا وہ لیے آنا ہوگا
 کیا تبھی ہوش میں آئے گی خلافت تیری
 کیوں تری بزم ہوئی جاتی ہے درہم برہم
 ظلِ سبحانی مری بات تو سن لی ہوتی



نرم بالو کا بچھونا ہے خنک اور مرطوب
 چاند مغرب میں بہت دُور کہیں جا پہنچا
 سطحِ جبلہ پہ گفہ ہے نہ محیدہ کوئی
 نوحہ خواں بزم بھی مدت ہوئی خاموش ہوا

۱۔ ایرانی آہنگر زادہ جس نے اپنی دھونکنی کے پرچم تلے عوام کا شکر جمع کیا اور صنماک
 سے زور آور غاصب کو شکست دی۔

گھنٹیاں بجتی ہیں، گرد اڑتی ہے، شور اٹھتا ہے
 کارواں موصل و شیراز کے آتے ہوں گے
 مشہد و یزد و صفاہاں کے امیروں کے سفیر
 تحفے ہر ملک کے ہر دیس کے لاتے ہوں گے

یا ہلاکو کے عساکر کا ہراول موہکا
 جس نے تسخیر ممالک کے عزائم لے کر
 آج بغداد کے ایوانوں کو تاکا ہوگا
 اب کوئی دم میں ہوا جاتا ہے سب زیر و زبر

کیا مگر اس سے بدل جائیں گے اپنے ایم؟
 ہوں، وہ مستعصم و ہاروں کہ ہلاکو کوئی
 جب تک اس نہج پہ چلتا ہے زمانے کا نظام
 کون کہتا ہے بدل سکتی ہے قسمت اپنی

کوئی موہوم سی اس آس پہ کب تک جی لے
 ٹھہرو اب کوئی فرستادہ غیب آئے گا
 آکے توڑے گا وہ افلاس کے غم کے بندھن
 پر جو مہدی کی بجائے وہ ہلاکونگلا

ابنِ آدم کا جہاں — دردِ ازل کا محور
 قیدِ غم سے کبھی آزاد بھی ہوگا کہ نہیں
 حسرتیں دل میں پلے جائیں گی کب تک آخر
 یہ حسرتا بہ کبھی آباد بھی ہوگا کہ نہیں؟

۳

اب تو لو پو بھی پھٹی - نور کا ترک کا بھی ہوا
 (اور میں اب تک یہیں بیٹھا ہوں، یہ عالم کیا ہے؟)
 رات کے آخری تاروں کا وداع خاموش
 صبح تازہ کی ولادت کا پتا دیتا ہے

اور کسی پاس کی بستی میں مؤذن کوئی
 اہلِ ایمان کو بلاتا ہے جماعت کے لیے
 اس کی آواز کا یہ سحرِ ترنم ، یہ گداز
 دل سے کہتا ہے یہاں سے نہ اٹھاؤ ڈیرے

دُور اک ریل کے انجن کی پریشاں سیٹی
 چنچ اٹھی ہے کہ تعطیل کے دن ختم ہوئے
 آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا ہوگا
 منتظر بیٹھے ہیں کرکوکؑ میں افسر میرے

پھر وہی سرفسک دودکشوں کی دنیا
 پھر وہی تیل کے چشموں کی فضاۓ بُودار
 پھر وہی سلسلہٴ جدِ گراں ، مزدِ قلیل
 اور وہی محل میں خواجہ کے طلا کے انبار

اور یہ خواجہ کہیں افسدگی ، کہیں امریکی
 جس کی صد رنگ سیاست کا طلسم سیمیں
 تسمہ پا بن کے ہے مشرق کی فضاؤں پہ سوار
 کب تک اس سحر کا معمول رہے گی یہ زمیں

۱۔ کرکوک عراق میں تیل کا مشہور مرکز۔ بغداد اور برصغیر کے درمیان واقع ہے۔

شہر زادوں کے تختییل کا وہ بغداد کہاں
 نفث و روغن کی سیاست ہے فضاؤں میں چچی
 بھیس میں تیل کے تاجر کے نکل آتا ہے
 اب بھی بغداد کی گلیوں میں خلیفہ کوئی

کوئی اس تاجرِ معصوم کے حیلے دیکھے
 صاحبِ خانہ بنا جاتا ہے کل کا مہماں
 چام کے دام چلاتے ہیں اجارے اس کے
 نام ہاروں کا ہو، فیصل کا ہو زیبِ عنوان



اب بجن را و سمرقند کی راہوں سے کبھی
 بہرِ یلغار نہ آئیں گے ہلاکو کے مغول
 آج کی دنیا ہے لارنس و گلٹ کی دنیا
 آج تسخیرِ ممالک کے ہیں کچھ اور اصول

ابروئے سٹم کا ادنے سا اشارہ ہو اگر
 قومیں بک جاتی ہیں اور تخت الٹ جاتے ہیں
 عظمتِ دہلی و ایتھنز تو افسانہ ہوتی
 ہند و یونان اسی حاتم کا دیا کھاتے ہیں

بصرہ و موصل و بغداد ہیں اس کی جاگیر
 روم و مصر اس کے ہیں نجد اس کا ہے شام اس کا
 اس کے سکے کے طفیل ایک جہاں میں آشوب
 آج بغداد کا ہاروں بھی غلام اس کا ہے

حرفِ ڈالر کی کرامت ہے کچھ ایسی بلوان
 حرفِ سم سم کا فسوں گرد ہوا جاتا ہے
 کچے دھاگے میں بندھی آتی ہیں سرکاریں بھی
 تیل دھرتی کی ہر اک نس سے کھنچا آتا ہے

۴

سِلِ انوارِ سحر پھیل چلا ہر جانب
 آخرِ شب کے دھند لکوں کا فسوں بھی ٹوٹا
 اب تو بہتر ہے کہ بستی کئی طرف لوٹ چلوں
 آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا جو ہوا

دل کے اُلجھے ہوئے احوال کو سلجھانے کے
 شہرِ ہاروں کے یہ پُر پیچ مستقف بازار
 میں سرائے سے جو نکلا تو پھرا سُوق بسُوق
 پھر بھی چھایا رہا جی پر وہی بے نام غبار

قہوہ خانے میں جو پل بھر کے لیے جا بیٹھیں
 آنکھلتا ہے اک آوارہ گداؤں کا ہجوم
 گونج اٹھتا ہے اک آوازہ شئی اللہ
 گھول دیتا ہے جو ہر جرعہ قہوہ میں زقوم

شہر و صحرا میں پلے جائے گی کب تک یہی بھوک
 عام کب ہوں گے الہ دین کے جادو کے چراغ
 کوئی شہزادہ نہ لائے گا کوئی ردِ طلسم؟
 کوئی انسان کو بتائے گا کوئی راہ فراغ؟



اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے نسیم
 لایا کرتی ہے دمِ صبح بہاروں کے پیام
 اور ہر پھول سے کہ جاتی ہے چپکے چپکے
 تم بھی چاہو تو بدل سکتے ہو گلشن کا نظام

لے شئی اللہ: کوئی شے دوزخدا کے لیے۔ بغداد کے گدا گروں کا عام نعرہ

تم کو آدم کے مقدر کے جگانے کے لیے
 بابل و نینوہ کے ساحر نہ بلانے ہوں گے
 مصر و بغداد کی بگڑی کے بنانے کے لیے
 مصر و بغداد کے جمہور جگانے ہوں گے

ورنہ کچھ سوچ کے بھرتا ہی رہے گا آپیں
 شاہی ڈیوڑھی پہ سیہ بخت غلام زنگی
 اور ہر موڑ پہ آوازۂ شایا اللہ
 ہر مسافر کے تعاقب میں رہے گا یونہی

شنگھائی

(ذیل کانوٹ مئی ۱۹۴۹ء میں نظم کی پہلی اشاعت کے ساتھ چھپا تھا)

شنگھائی جو چین کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور دنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اپنی شبینہ عشرت گاہوں اور کلبوں کے لئے مشہور ہے، لیکن انہی کلبوں کے دروازوں کے آگے شنگھائی کے فٹ پاتھوں پر ہر سال اوسطاً تیس ہزار انسان بھوک اور سردی سے جان دے دیتے ہیں۔ شنگھائی میں مزدوروں کو بارہ سے سولہ گھنٹے تک روزانہ کام کرنا پڑتا ہے، لیکن ان کی بد حالی دنیا بھر میں ضرب المثل ہے۔ مزدوروں کے بڑناں کرنے اور کرانے کی سزا عموماً موت ہے۔ شنگھائی میں قدم قدم پر بدبھیت مائیں، زرد رو اور نزار بچوں کو گھٹریوں کی صورت میں پیٹھ پر ڈالے اپنے استخوانی ہاتھ پھیلائے صدا لگاتی دکھائی دیتی ہیں۔ ”کم شامسٹر نوچو“ (بابا ایک پیسہ دے جاؤ) ماں صدا لگاتی ہے اور پیٹھ پر جکڑا ہوا بچہ اسے دہراتا ہے۔ آگے چلے تو ہزاروں لوگ گروہ درگروہ دیواروں کے ساتھ دبکے اپنے سر گھٹنوں میں دیئے پیل پیل بے جان آنکھیں نکالنے زبان بے زبانی سے بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں اور مہموم اُمید میں آسمان کی طرف نظریں اٹھائے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں

اس شہر کی بین الاقوامی بستی میں جو غیر ملکوں کا مرکز تھا، ایک زمانے میں ایک باغ (بند گارڈن) کے دروازے پر یہ بورڈ آویزاں تھا :

DOGS AND CHINESE NOT ALLOWED

۱۲

شام کے گھرے سائے پھر پیغام اُداسی کا لے آئے
 دردِ جو دل میں جاگ اُٹھے پھر دل بہلے کس کے بہلائے
 ہوٹل کی چھت پر لیٹا ہوں جانے کیا کیا سوچ رہا ہوں
 کروٹ کروٹ بات وہی ہے، نیند کسی پہلو بھی نہ آئے
 دیس پر ایسا دوست نہ بیلی، حالِ غم دل کس سے کہوں میں
 کون سمندر چیر کے آئے، میری لگی کو آ کے بھلائے

پائیں باغ کے گرجا کے گھڑیاں ہیں گیارہ بج بھی چکے ہیں
 بازاروں کا شور و شغب بھی لمحہ بہ لمحہ تھمتا جائے
 دریا کی پہنائی میں اک اسٹیمر کی سیٹی گونجنے
 کس کو خبر ہے کس منزل کو جائے ہے اور کس کو بلائے

چاند نے بھی پورب کے جھروکے میں اپنا ٹکھ دکھلایا ہے
چاند سے باتیں کون کرے جب درد ہی دل میں اُٹا آئے

ہوٹل اب سنسان ہوا جاتا ہے مسافر سونے چلے ہیں
مجھ کو مگر اس بستر کی ایک ایک شکن ڈسنے کو آئے
بین الاقوامی بستی میں چہل پہل اب تک ہو شاید
اور کہیں اس دل کو بھی اپنے درد کا درماں مل ہی جائے
لڑکے دیکھ مرے بستر کو دھیان میں رکھنا چوکس رہنا
سیر کا یہ بھی وقت ہے کوئی سوچ کے لڑکا بھی مسکائے

شگنائی کے پیلے پیلے سربفلک تاجر محلوں سے
بچتا بچاتا کہیں کہیں ساگر کی ہوا کا جھونکا آئے
بین الاقوامی بستی کی عشرت گاہیں جاگ رہی ہیں
نغمے کی اک موج کبھی تھم جائے کبھی طوفاں ہو جائے
سینماؤں کے دروازوں سے افرنگی جوڑے نکلے ہیں
ہاتھ کمر میں، پلکیں بوجھل، شانوں پر زلفیں بکھرائے

ایک کا یا بارہ کا عمل ہے

آج کی پکچر لمبی تھی

آؤ بھی مادام آؤ بھی

ایسے میں گھر کیا جاؤ گی

آدھی رات تو بیت چکی

میڈونا ہوٹل میں چلیں گے

رکشا اور چینی کے بچے

رکشا لا !

آج بہت پی پی ہے جانی

قدم قدم پر بہک رہی ہو

آؤ اور قریب آ جاؤ

آدھی رات تو بیت چکی

ٹم ٹم دیکھ رہا ہے کیسے

اور چینی اور مرلی پلے

رکشا لا !

رکشا والا مرل پلاٹک ٹک کس کو دیکھ رہا ہے
 تاجر کو جو مہماں بن کر آئے اور آقا بن جائے
 رکشا قلی کو یاد ہیں شاید اب تک وہی پرانی باتیں
 کیسے اکٹ پھم کا بیوپاری کاندھے پر بکس اٹھائے
 چین دیس میں آیا تھا اور میٹھی بولی بول رہا تھا
 میٹھی بولی جیسے کوئی بات بات میں شہد ملائے

اے چینی، اے بھائی چینی!

اے چینی افیون توکھا!

تیرے دوانوں کے آگے دُنیا بھر کا سر نیچا

تیرے بنا ساری دُنیا میں چوہٹ اندھیارا ہوتا

ہم تو نرے بیوپاری ٹھہرے ہم کو کسی سے کیا لینا

اک کوٹھی کی جگہ دلا دے اے چینی افیون توکھا!

میڈونا ہوٹل کے اندر لوگوں کا میلہ سا لگا ہے
 ساغر کھنکس، کاگ اُٹے بوتل کا اور مستی چھا جائے
 بال روم کے دھندے دھندے شیشوں میں سے جھانک رہے ہیں
 سینہ بہ سینہ، چہرہ بہ چہرہ، ٹپا لے ٹپا لے سائے
 ایک میز پر ایک البیلینگی بیٹھا ڈینگیں مارے
 ایک طرف اک بڈھا ٹامی بیٹے دنوں کی بات سُنائے

اس بستی کا بچہ بچہ ہم لوگوں کو سجدہ کرے تھا
 اس بستی میں ہم لوگوں نے لاکھوں کیا اربوں ہی کمائے
 بند گارڈن کے دروازے پر یہ بورڈ لگا رہتا تھا
 ”کوئی بھی چینی کوئی بھی کتا باغ کے اندر آنے نہ پائے“
 آج مگر اسکولوں کے لڑکے بھی ہمارے منہ آتے ہیں
 کوئی مری سب دولت لے لے! بیٹے دنوں کو واپس لائے

میڈونا ہوٹل کے باہر لوگوں کا میلہ سا لگا ہے
 بھک منگوں کے غول کھڑے ہیں ہاتھوں کو کشکول بنائے
 ایک طرف پٹری کے نیچے ننگی بھوک کی روگی مائیں
 اُونگھ رہی ہیں اندھی بہری دیواروں سے ٹیک لگائے
 سڑکوں کے ایک ایک موڑ پر ننھے بچے بڈھے چینی
 پیسے چنچ رہے ہیں دانت نکوسے کوئی سخی پیسہ دے جائے

میڈونا ہوٹل کے باہر شنگھائی کے فٹ پاتھوں پر
 آئے برس جاڑے کے دنوں میں پالا اُترے جھکڑ آئے
 کال کے مارے ننگے بھوکے تیس ہزار انسان ایسے ہیں
 مرجائیں چپکے ہی چپکے۔ بھاگ کالکھا کون مٹائے
 صاحب شور مچا دیتے ہیں، بو سے ناک پھٹی جاتی ہے
 کونسل والے پیسے اٹھتے ہیں، اتنی لاشیں کون اٹھائے

رات بھی دن بھی شپ شپ شپ شپ پہتے چالیں ولر گھو میں
 شنگھائی کی فیکٹریوں کی ماشینوں کو نیند نہ آئے
 چھن چھن چھن چھن سونے کے سکے بنک میں جا کر گرتے رہائیں
 مالک کی ٹھوڑی پہ ہمیشہ ایک نئی تہ چڑھتی جائے
 چہرے کی رونق بڑھتی جائے روز نئی تدبیریں سوچیں
 اب کے برس کچھ چال چلیں ایسی کہ منافع چوکھا آئے

فیکٹریوں میں شپ شپ شپ شپ پہتے چالیں ولر گھو میں
 سولہ گھنٹے کام کرے مزدور پلک جھپکا نا پائے
 چھن چھن چھن چھن سونے کے سکے بنک کے تھیلے بھرتے جائیں
 چھ آنے کا پانے والا بات کرے اور گولی کھائے
 کہیں کہیں پر دبی دبی مسریادوں کا اک مدھم ریل
 ماشینوں کے شور سے یکدم اُبھرے اور بھرتا جائے

ایک آواز:

اے ساتھی یہ جاگم ڈیوٹی مدح کریں پر چین نہ پائیں
 کس سے اپنا حال کہیں ہم کس کو اپنا درد سنائیں
 کھون پسینے فسق نہ سمجھیں بھاری بھر کم ملیں چلائیں
 پھر بھی ہمیشہ دل میں یہ دُباہا کل کیا پنہیں کل کیا کھائیں
 پیٹ پہ پتھر باندھ کے سوئیں فٹ پاتھوں پر عمر بتائیں

دوسری آواز:

ایک ہمیں پڑت نہیں ساتھی ایک ہمیں دکھیاے نہیں ہیں
 اور بہت ساتھی ہیں ہمارے ہم اتنے بیچارے نہیں ہیں
 ہم دھرتی کا پوٹا چسیریں کو لا لوٹا بھر بھرا لائیں
 رکش کھینچیں ریشم کاتیں نہریں کھودیں، محل بنائیں
 ہم کھیتی کو پانی دیویں ہم کھیتی سے اُن اُپجائیں

پہلی آواز:

ہم کھیتی کو پانی دیویں ہم کھیتی سے اُن اُپجائیں
 پھر کیوں اتنے شک بھلیں ہوک سے چٹکارا نا پائیں

پرب، پچھم، اتر دکن آگے پیچھے دائیں بائیں
کال کے راجس چار کوٹ میں گدھوں کی ضرورت منڈلائیں

دوسری آواز:

اے ساتھی یہ بات نہ پھیرو بات کریں توجیب کٹائیں

پہلی آواز:

ٹک ٹک بیٹھے کب تک لیکن یہ انباٹے دیکھے جائیں
یہ جلا د حکومت والے ہمرا پہنیں، ہمرا کھائیں
ہمرا ساتھی ملک بددہوں ہمرا ساتھی جیل میں جائیں
ہمرا نیتا پھانسی لٹکیں ہمرا نیتا گولی کھائیں

(دونوں آوازیں مل جاتی ہیں۔ پھر بیسیوں آوازیں، پھر سینکڑوں)

کل جو ہوا ہے اب نہیں ہوگا

فیکٹریوں سے نکلواؤ

رکشا موٹر، ریلیں چھوڑو

بسیں گراہوں میں پہنچاؤ

اسے دفتر کے بابو زکلو
 پوتھی کو دریا میں بہاؤ
 پڑھنا لکھنا کل پر چھوڑو
 اسکولوں کے بڑ کو آؤ
 آج یہ بیری جلنے نہ پائیں
 گھیرا ڈالو ہاتھ دکھاؤ
 کونگ سونگ کو گولی مارو
 چیانگ کو پھانسی پر لٹکاؤ
 ماؤ کی فوجیں کتنی دور ہیں
 ماؤ کی فوجوں کو بلواؤ
 ماؤ کی فوجوں کو بلواؤ!

۴

شنگھائی کے اسٹیشن پر بندرگہ پر پھیر لگی ہے
 دیکھیں کب اسٹیمر چھوٹے کب دکھن کو گاڑی جائے
 سڑکیں وہی ہیں اور سڑکوں کے موڑ وہی پر رفتہ رفتہ
 اک شنگھائی دم توڑے اور اک شنگھائی ابھرائے

ایک ایک انسان کے دل میں آگ کی لٹیں جاگ رہی ہیں
ان لالٹوں کو کون دبلے، اس جوالا کو کون بجھائے

یہ ریلا توڑک نہ سکے گا، یہ موجیں تو تھم نہ سکیں گی
ینسی کا طوفانِ خروشاں بڑھتا آئے چڑھتا آئے
نوبت بلجے، قرنا پھونکیں ماؤ کے دہقان گولیلے
ان کی لگن کو کون خریدے ان کی قیمت کون چمکائے
میدان ان کے پاؤں کی مٹی، جنگل ان کو گھاس کے تنے
دریا نامے حکم کے بندے، پریت ان کو سیس نوائے

شنگھائی میں، تھکتے ہیں لوگوں کو پیغامِ سناو،
بھوک سے ننگے فٹ پاتھوں پر اسے کوئی مرنے ناپائے
سائیکلون میں کولمبو میں سب کے دل میں جوت جگادو
رونے کے دن بیت چلے اب کوئی نہ دکھیا نیرہائے
رات جہاں بلوان ہوا اب تک، آشاؤں کے دریپ جلا دو
اُجلے دنوں کی دھندلی ربکیما اندھیاروں میں ڈوب نہ جائے

مضافات

’جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا‘

۱

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظم حسین لکھوں گا
اپنی محبوبہ بے نام کی زلفوں سے طویل
اپنے مجبور ارادوں سے زیادہ بے باک
اپنی خاکسترافسردہ کے شعلوں کی دلیل
جیسے برسات کی راتوں میں پکتا کوندا
چیر دیتا ہے گھٹا ٹپ سیاہی کی تفصیل

آج اس نظم کی تکمیل کا سودا لے کر
 پھر مضافات کے کھیتوں میں نکل آیا ہوں
 ریل کے پل کی سلاخوں کا بہارا لے کر
 سوچتا ہوں کہ سرِ راہ یہیں دم لے لوں
 دُور وہ دُھند کا بادل ہے کہ گھاڑی کا دُھواں
 اور وہ نظم جو لکھنی ہے، مگر کیا لکھوں؟

اپنے یاروں سے جدا ہو کے یہ عالم ہے کہ آج
 دل نہیں قحط کا اُجڑا ہوا ویرانہ ہے
 اب ہیں بے مہرئی جاناں ہی کی باتیں باقی
 اب فقط برسمی زلف کا افسانہ ہے
 اب نہ بغداد کی اس رات کی یاد آتی ہے
 اور نہ شنگھائی پہ یلغارِ حریفانہ ہے
 اک شنگھائی دم توڑے اور اک شنگھائی اُبھر
 ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
 دُور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

پھول دامن سے لپٹتے تھے تعطر بکنار
 خار بے تاب تھے ہر راہ میں بچھ جانے کو
 اور اک دوست سِرِ طنز پکار اٹھاتا
 ”کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو“

اور میں ایک سے اک راہ میں افتاں خیزاں
 کتنے امصار و ولایات سے ہوتا ہوتا
 کتنے ہم رنگِ زمیں داموں سے بچتا بچتا
 لکڑ ابر گریزاں سِرِ دشت و صحرا
 شہرِ خواباں کے بھرد کوں کا تصور باندھے
 ایک دن ایسی ہی اک شام یہاں آنکلا

کتنا خوش تھا کہ اب اُس شہر کو چھوڑ آیا ہوں
 جس میں آزادہ رومی جُرم گنی جاتی ہے

صبح تازہ کو ہے افسردہ شاعروں پہ غرور
 رات بے نور ستاروں کی قسم کھاتی ہے
 عشقِ سادہ کو جہاں رشتہ بیا رکھتے ہیں
 عقلِ گستاخ کہیں راہ نہیں پاتی ہے

اب یہاں بیٹھ کے لکھیں گے محبت بھرے گیت،
 میرے شاعر نے کہ دل میں تھا مقید بیٹھا
 پھر اسی غمزہ مانوس سے انگڑائی لی
 پھر انہی ملگجے اوراق کا دفتر کھولا
 اور پھر کلک گس بار کے اوپر جھک کر
 ایک مسجود خیالی سے یہی عرض کیا:

میں ترے مصرع میں بک جاؤں سرِ راہ گذر
 میں ترے مصرع کے بازاروں میں سوا ہو جاؤں
 تیرے اشعار مجھے توشہٴ ارزاء سمجھیں
 میں ترے شہر میں نذرِ غمِ دنیا ہو جاؤں

مجھ کو ناکردہ گناہی کی سزا بھی منظور
کیا ہے اک بار جو معنوبِ زلیخا ہو جاؤں

اب مگر جانبِ کنگاں نہ قدم اٹھیں گے
مجھ کو معلوم ہے معمورۂ کنگاں کیا ہے؟
مجھ سے پوشیدہ نہیں خاکِ وطن کی قیمت
معنی خار و خس و سُنبل و ریاں کیا ہے
کتنی بے مہر ہوا کرتی ہیں گھر کی یادیں
زلیست میں مرحلۂ شامِ غریباں کیا ہے

میں غمِ شامِ غریباں کا گلہ مند نہیں
زہر لگتے ہیں وطن کے در و دیوار مجھے
جانے کیا سوچ کے جنت سے نکل آیا ہوں
تہمتِ گندم و حوّا سے ہے انکار مجھے
میری سرگشتگی عشق پہ جائے نہ کوئی
رسن و دار کا سمجھے نہ سزاوار مجھے

لیکن اس شہر کے کوچے بھی وہی کوچے ہیں
 یہ نیا شہر خیالوں کا نسیا شہر کہاں
 ایک کانٹا ہے کہ سینے میں کھٹکتا ہے ہمنوز
 اک چھلاوا ہے کہیں ذہن کی قبروں میں نہاں
 پھر کوئی منزلِ دشوار بُلّاتی ہے مجھے
 دل کی وحشت کا ٹھکانا تو یہاں ہے نہ وہاں

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظمِ حسیں لکھوں گا
 لیکن افکارِ حسیں ذہن میں آتے ہی نہیں
 تا قلم آکے پھسل جاتا ہے کیا کیا مصرع
 سنگلاخ اتنی بھی ہر قی نہیں شعروں کی زمیں
 شوق کہتا ہے کوئی دم تو اٹھا لو یہ حصار
 عقل کہتی ہے وہی دشت نہ قسمت ہر کہیں

اور ادھر کوچہ و بازار کی پہنائی میں
 جانے کیا شور ہے — یہ شورِ قیامت ہی نہ ہو

عقل کہتی ہے دریچوں کے گرا دو پردے،

شوق کہتا ہے۔ 'نہیں' دل کو ٹٹولو، اٹھو،

'میں اسی برج میں رہتا ہوں مرا نام یہ ہے

دوستو کس کو بلاتے ہو، کہو کچھ تو کہو،

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے بچائے گا کوئی؟

گل ہوئی جاتی ہیں اس برج کی ساری شمعیں

کیا ہوئے محفلِ انصاف و دیانت کے مغاں

آج ہم دل کی حکایت جو کہیں کس سے کہیں

'اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجیں گے

تاکہ گھبراہٹیں تو ٹکرا بھی سکیں، مر بھی سکیں،

مالرو مستمر حلقہء دیگال ہے آج

سارتہ کا مہِ نغشب ہے سرِ شامِ غروب

آج لہمیں کا تکیہ ہے مزاجِ یورپ

اور آڈن کو فقط رُوحِ مسیحی محبوب

اِشَرُوڈ آج رشی یوگ کے سادھن سیکھے
کل کا ناخوب سپینڈر کی نظر میں بہواخوب

۴

وقت کے ساتھ مفادات بدل جاتے ہیں
ورنہ اب بھی وہی تقدیر جہاں ہے کہ جو تھی
آج پھر جنگ کے بادل ہیں فضاؤں پہ محیط
دل پہ کلچر کے سپاہی کی سناں ہے کہ جو تھی
فاشیت تازہ عزائم کو لے اُٹھی ہے
امن والصاف کی آواز کہاں ہے کہ جو تھی

میڈرڈ اب بھی ہمہ وقت لہو روتا ہے
وا دیاں بار سلونا کی ہیں زنداں اب تک
جن میں سوتے ہیں بریگیڈ کے جانباز اپنے
قرطبہ کے وہ نواحیات ہیں ویراں اب تک
ان کی قبروں پہ صلیبیں نہ کوئی لوحِ مزار
یہ مسافر ہیں رقیبِ سرو ساماں اب تک
سادھن - طریقے

سحر ٹوٹا نہیں بابل کے خداوندوں کا
 کتنے فرعون خراہاں ہیں سرِ ساحلِ نیل
 کتنے روم ہیں شہنشاہیٰ نیرو میں نزار
 پمپیاٹی ہیں بہرِ سیمانہ تماشوں کے قتیل
 جس کے گھاؤ کی تراوش سے سمند ہوئے سُرخ
 اب بھی یونان کے سینے میں ترازو ہے وہ کیوں

وارِ سا ہے کہ سنہلنے بھی نہیں پایا ہے
 خون اب تک ہے بڑا پٹکے سینے سے رواں
 اب بھی دلگیر ہے دیروز کی یادوں سے چراگ
 اور مغرب کی طرف تکتا ہے حیراں حیراں
 فاختہ لائے گی پیغامِ کرسمس کہ عقاب ہے
 کونسی شے ہے سراپردہ مغرب میں نہاں

کشتِ دہقان کو روندیں گے دباؤ آکر
 گولیاں ڈھلتی ہیں گمنام سپاہی کے لئے

سر پہ طیاروں کی گھمکار سناؤ دے گی
 دشت و کسار پہ چھا جائیں گے فوجوں کے پرے
 جیسے مجلس سے نکل آئیں سلیمان کے جن
 جیسے پنڈورا کے صندوق کا کھٹکا کھل جائے

۵

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظمِ حسیں لکھوں گا
 پر یہ کس سمت سے آنے لگی بارود کی بو
 کوریا دور ہے، اتنا بھی مگر دور نہیں
 کھیت اچڑتے ہیں، زمین ٹھنکتی ہے، بہتا ہے لہو
 جسم نازک سے گزر جاتا ہے جلتا سیسہ
 ٹوٹ جاتا ہے بیک ضرب جوانی کا سُبُو

کانٹا چُھتا ہے تورگِ رگ کی خبر لاتا ہے
 ایک کی مرگ سے ہوتا ہے زمانہ غمگیں

جنگ ہوتی ہے تو سنگینیں بھی چھتی ہیں ضرور

مرنے والوں کا شمار ایک نہیں سو بھی نہیں

کوئی بیٹا ہے کہ پیارا ہے کہ بھائی ہے کہ باپ

کچھ تو ہے جس سے ہوا جاتا ہے میدانِ رنگیں،

اور میں سوچتا ہوں، امن کے بونے تک ہیں

زندگی کے سبھی ساماں، غمِ جاناں کے سمیت

میرا کالج، مری سیریں، مرے شاعر مرے گیت

میرے غنچے، مری بلیں، مرے خرمن، مرے کھیت

میرے چہرے، مرے سینے، مری راتیں، مرے چاند

میری وادی، مرے دریا، مرے ساحل، مری ریت

پھر توجے گاڑوں کے ٹکراؤ سے دبے گی زمیں

پیس ڈالیں گے نی پود کو ٹینکوں کے خراس

یاد گاڑوں میں بنائیں گے منارے کبھی گیٹ

آپ وہ لوگ نظر آئیں گے پھر دُور نہ پاس

ایک اک گھر میں جو سیلابِ بلا اُڑے گا
اس کو روکیں گے نہ انعام نہ تمنے نہ کر اس

میں تو چینی ہوں نہ نیکی ہوں نہ کالا ہوں نہ لال
بس یونہی سیر کو کھیتوں میں نکل آیا ہوں

امن اک حرفِ یاست ہے کہ کچھ اور بھی ہے
یہ سمجھ میں کہیں آجائے تو آگے بھی چلوں
دُور وہ گیس کا بادل ہے کہ توپوں کا دُھواں
اور وہ نظم جو لکھنی ہے — مگر کیا لکھوں؟

امن کا آخری دن

آج کیوں شام کے اخبار کی ہر سُرخِی میں
ایک اک لفظ بُنے جاتا ہے اُجھے ہوئے جال
دسو سے اُڈے چلے آتے ہیں بادل بادل
کلبلاتے ہیں پڑے ذہن کے گوشوں میں خیال
اب تو ہر سطر سے آنے لگی بارود کی بُو
اب تو ہر صفحے سے بے کھٹکے گزرنا ہے محال

بہرِ شبنون بڑھے آتے ہیں یادوں کے ہجوم
دیکھیں کیا حال بنے صُبح کے ہوتے ہوتے
اتنی سوچیں ہیں کہ پہلے کبھی سوچی ہی نہ تھیں
اتنے چہرے ہیں کہ پہلے کبھی دیکھے ہی نہ تھے

اب تو کابوس کی صورت ہیں رگ و پے پہ محیط
شام تک وہ جو بھی نقش تھے دھندلے دھندلے

الف آندھی ہے کہ مغرب سے اٹھا چاہتی ہے
الف امید چسراغِ تیرا ماں ہے ابھی
الف اٹم ہے باغوش ہزاراں آشوب
الف آدم کہ بہ غم چاک گریباں ہے ابھی
الف اک امن کہ جاں دی تھی تو پایا تھا اسے
الف اک اشک کہ مرگاں پہ فروزاں ہے ابھی

ب وہ بندوق کہ اک روز کہیں سر ہوگی
ب وہ بمباروں کا بھر مٹ ہے کہ بڑھتا آئے
کبھی دہقاں کے گھروندے پہ تو خرمن پہ کبھی
بے اماں برق کا کوندا ہی پڑا ہراے
قریے قریے سے پکتی ہوئی لاٹیں اٹھیں
بستی بستی کو شراروں سے جھلتا بجائے

پَ ہے پنشن کہ سپاہی کو شجاعت کے عوض
 ایک پہلو میں ٹھمکتی سی بساکھی دے جائے
 پَ وہ پلٹن ہے کہ اڑ کر سر میدان پہنچی
 پَ وہ پیارے ہیں کہ میدان سے نہ واپس آئے
 ت وہ تمنہ ہے کہ برسوں کی ریاضت سے ملے
 اور کسی لاش کی چھاتی پہ چمکتا رہ جائے

ت کسی باغِ جوانی کی لچکتی ٹہنی
 ہم کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے ہے پارا پارا
 بوڑھے ماں باپ کی برسوں کی دعاؤں کا ثمر
 ت کسی اجنبی میدان میں دم توڑ گیا
 لوٹتے قدموں سے گونجے گی نہ گھر کی دہلیز
 آپ کا تختِ جگر ملک پہ فُتربان ہوا

ج وہ جنگ کا بازار ہے جس میں جا کر
 اتنی صدیوں میں بھی انسان کی قیمت نہ بڑھی

سچ وہ چاندی ہے وہ چاندی کے چمکتے سکے
جن سے دنیا کی ہر اک چیز خریدی نہ گئی

پھر بھی ہر بیس برس بعد وہی سودے ہیں
وہی تاجر ہیں وہی جنس ہے قیمت بھی وہی

حکایت ہے کہ ہونٹوں پہ ادھوری رہ جائے
ح وہ حسرت ہے کہ سینے کو بنالے مدفن
خ خیالات کا ریلا ہے کہ یکسر رک جائے
دب کے رہ جائے جو خندق کے خلاؤں میں بدن
ٹینک کر دیں گے ہر اک ڈھیر کو آکر ہموار
بے نشان قبروں پہ آگ آئیں گے دو سال میں بن

دے دے درد سے لبریز دلوں کی دھسرتی
ڈے ڈے ڈولتا سینہ کبھی ڈھلکا آنسو
ذہے ذکر کسی دوست کا وہ ذکر جمیل
ہائے کن رفتہ بہاروں کے گلوں کی خوشبو

آج لاشوں کے تعفن میں دبی جاتی ہے
سرد سنگینوں کے زخموں سے اُلتا ہے لہو

رَوہی ریل کی سیٹی وہی رعنا چہرا
رَوہی رات وہی اُس کے بھیانک سپنے
چونک کر کون یہ بستر سے یکایک اٹھا
”میرے بچے کو خداوند سلامت رکھے“
ایک تارا کہیں ٹوٹا تھا کہیں ڈوب گیا
ڈاکیا آئے گا دو روز میں اک تار لئے

زبے وہ زہر کہ پھر رُوح میں گھل جٹے گا
زبے وہ زخم کہ لاتا ہے خبر دل تک کی
اب بھی بستی میں بڑے پیر کا میلہ ہوگا
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بہار آئے گی
پر نہ ان راہوں سے لوٹے گا بنسی والا
اب چراگاہ میں گونجیں گی نہ تانیں اس کی

سَ سہرا کسی دُولہا کا کسی سیج کے پھول
 سَ جلتا ہوا سیسہ کسی سنگین کی دھار
 سَ ساحر ہیں سیاست کے کہ گھر میں بیٹھے
 اپنے زانو پہ لئے صبح کے سارے اخبار
 سوچا کرتے ہیں یہ پڑھتے ہوئے تازہ خبریں
 روٹی کے بھاؤ میں ہوتا ہے چڑھاؤ کہ اُتار

اپنے اس شہر سے ہیں دُور وہ میدان جن میں
 شِش شعلہ ہے کہ بارود کا سینہ چاٹے
 کسی مسجد کا منارہ، کسی اسکول کی چھت
 اک دھماکے میں مُلگتا ہوا ملبہ بن جائے
 کوئی کھیتی کوئی کرخانہ کوئی پُل کوئی ریل
 ایک دُنیا ہے کہ برسوں میں بنائے نہ بنے

صَ وہ صبح کہ ہر ذہن کی پنسائی میں
 لاکے بودیتی ہے نادیدہ سلیبوں کی قطار

ضن خبروں کے ضمیموں کا وہ اُگلا ہوا زہر
 جس سے کچھ اور ہی بڑھ جاتا ہے وحشت کا فشار
 ناچنے لگتے ہیں بے تابی سے فہرستوں کے ہم
 آنکھیں بن جاتی ہیں روکے ہوئے اشکوں کے مزد

طہر و ق کا صحرا ہے جہاں سے اب بھی
 اپنے گم گشتہ عزیزوں کی صدا آتی ہے
 اس جگہ فتح کی خبریں ہیں نہ جلسے نہ جلوس
 ایک صرصر بے کہ آتی ہے گزر جاتی ہے
 استخوانوں سے بھلا کس کو محبت بہوگی
 یاں کوئی دوست نہ ہمدم نہ ملاقاتی ہے

ظلمات کا دریا ہے کہ طوفان بدوش
 آس کی ننھی سی کشتی کو ڈبونے آئے
 اور جب ظلم کی میعاد کے دن اور بڑھیں
 عہد عشرتِ فردا ہے کہ عنقا ہو جائے

غَ وہ غم ہے کہ جاناں سے نہ دوراں سے ہے تھیں
دل مگر اس کی کسک سے نہ سننے پائے

فَ ہے وہ فتح کہ کچھ لے تو گئی دے نہ سکی
فَ ہے فردا کہ چلا دے کا چھلاوا ہی رہا
قَ قریہ ہے کہ اتنا بھی نہ دیراں تھا کبھی
اب نہ چوڑھوں سے دھواں اٹھتا ہے نیلا نیلا
اور نہ وہ کھیت نہ وہ فصلیں نہ وہ رکھوالے
ایک اک گاؤں کے چوپال میں اُتو بولا

کَ مینوں کے کمل کَ کتابی چہرے
کَ کاکل ہے کہ خوشبو میں بسی رہتی تھی
اور جب دُور کے دیسوں کے سپاہی آئے
کَ کرگس نے کھلے کھیت یہ بازی جیتی
کوڑیا کتنے خرابوں کا پتا دیتا ہے
یہ جگہ شہر تھی یہ گاؤں تھا یہ بستی تھی

گ گاتی ہوئی گوئی ہے کہ گن سے نکلے
 کسی گمنام سپاہی کا نشانہ باندھے
 ایک سایہ کسی کھائی میں ترپتا رہ جائے
 اپنی برسوں کی تمناؤں کو سینے میں لئے
 گ گبرو ہے کہ ہائیس بہاروں میں پلے
 ل لاشہ ہے کہ دو روز کے اندر سر جائے

م محبوب کا آغوش بھی ہے موت بھی ہے
 ایک ہی وقت میں ممکن نہیں دونوں سے بھاؤ
 ن ندی کا مدھر نغمہ بھی نیپام بھی ہے
 اب اسے دوست بناؤ کہ اسے دوست بناؤ
 زلیست اور موت میں مشکل نہیں جانبداری
 سیدھی باتوں کو دلیلوں کے لبادے نہ پنھاؤ

وہے وقت کہ ہاتھوں سے بے نکلا جاتا
 واہمے دیتے ہیں اگر درِ دل پر دستک
 فاختہ کتنی بھی طیار و سبک سیر سہی
 سینکڑوں کوس ہیں بمبار کی رفتار تلک

امن کے گیت کی لے تیز کرو تیز کرو
ساحلِ دور سے آنے لگی توپوں کی دھمک

وہ ہیرو ہیں کہ پھر نکلے ہیں چھیلے بن کر
بستی بستی کو ہر و شیمایا بتانے کے لئے
میں وہ یادیں ہیں کہ دُھندلائیں نہ مٹنے پائیں
اور ہم جنگ کی دہلیز پہ پھر آنکے
میں وہ یوسف کہ خدا کو بھی نہ سوچنے جائیں
پھر انہی اجنبی میدانوں کا رستہ لیں گے

آسماں تیرہ و تاریک ہے، تارے مغموم
چاند بادل سے نکلتے ہوئے گھبراتا ہے
شمع اُمید کی کوکانپ رہی ہے کب سے
دل دھواں دھار گھٹاؤں میں دبا جاتا ہے
لو کسی دُور کے گر جا میں وہ گھرِ یال بجا
قافلہ صُبح کا آتا ہے — کہاں آتا ہے؟

اُفتاد

دکن ستائے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

’اختر الایمان‘

۱

نگاہوں کی دوری کی دُشوار منزل میں تم آج سے دُور تر ہو گئے ہو
شبِ ہجر کی ادیں منزلوں سے گریزاں مثالِ سحر ہو گئے ہو
تمہیں زیست کے موڑ پر آ کے ملنے کے وعدے کی میعاد تو اچلی ہے
مگر اب تو کچھ پاؤں تھکے چلے دُور کی باٹ ہے شام دُھندلا چکی ہے
وہ اتر کے ملکوں سے کوئیں رُپہلی مسلسل مسلسل چلی آ رہی ہیں
وہ پچھم سے اُٹے اندھیرے کی پرچھائیاں سرسئی نیکھ پھیلا رہی ہیں

وہ پُرب میں مہیاتی بھیرٹوں کے گلے کے بانے کے پہلو میں ہکا اڈا
مگر کالے کوسوں کی دشوار منسل کہے جا رہی ہے ابھی لٹ جاؤ

بنک پاند نے سرمئی شام کی بھاری چمن کو سرکا کے چہرہ دکھایا
اُداسی کے گرداب کے دائرے اور گہرے ہوئے جانے کیا یاد آیا
فضاؤں میں کچھ جانی پہچانی شکلیں ہیولوں کی صورت کہیں تیرا میں
کسی نے سر صبح ڈیوڑھی پہ آکر گئی شب کی ناشاد خبر میں سنائیں
بایں چاکِ داماں بھی کتعاں کے یوسف ندیے گناہی کی کیا کیا نہ لائے
مگر قلعہِ مصر کے اونچے برجوں کو زہار زہار جھکنا نہ آئے
یہ ہالی کے پیلوں کی جوڑی کے گھنگرو جھنا جھن بجے جا رہے ہیں
کہ یادوں کی ویران راہوں پہ دوستوں کے وہی قافلے آ رہے ہیں

شبِ ماہ میں گھومتے گھامتے شعر سنتے سنتے سحر کرنے والے
وہ سرمست و آوارہ احباب اپنے وہ سپنوں کے لوجھی منگوں کے پانے
کسی ساحل بحرِ ذخار کی سیپیاں چنتے چنتے کہاں کھو گئے ہیں
کہ ان کی جبینوں کے روشن چراغوں کی یادوں کے شعلے بھی مدہم ہو گئے

اے اُنچے اُنچے حرمیوں کے اوپر سے پرواز کرتے پرندوں کی ڈارو
 سنو تو سہی کوئی دم کو ہمیں ساتھ لے جاؤ ان دوستوں میں اتارو
 مگر گاؤں کے جھوپڑوں کا دھواں جس میں رنگِ شفق تھوڑا سنولا رہا ہے
 نگاہوں کی دُوری کے پردے کی مانند دیوارِ محکم بنا جا رہا ہے

۲

مے دل کے روشن جھروکے سے جہان کا ہے پھر ایک معصوم و شاد تہرا
 تصور مجھے تیرے مجبور جلوؤں کا خاموش پنہام دیتا رہے گا
 اسے اپنی وحشت کی افتاد سمجھیں کہ پندارِ مجبور کی بے نیازی
 بہت دن بساطِ جہاں پر ہے پر یہ نردیم نہ چھوٹیں یہ کھیلی نہ بازی
 رفیقوں نے اپنے مصافِ جہاں میں ولایات جیتی ہیں میدانِ مالے
 مگر ہم تو ان سے بچھڑ کے لڑائی کے پہلے ہی میدان میں اپنے سے مارے
 کوئی آشنا شناسی خلش پھر بھی مجبور کرتی ہے بولونہ بولو
 کہیں سے بونے دوست آنے لگی ہے درامن کی ڈیوڑھی کی کندھی تو کھولو

بہت روز کی بات ہے سہ راتوں میں اُنہی چراغوں کے سایوں میں لیٹے
 کتابوں کے قصوں کے جنوں سے دنیا زمانے کے اسرار لپچھے تھے ہم نے
 سنا تھا ہماری ہی رات تک یہی ہیں پختہ کی پریاں سر پرے سنوائے
 مگر کوئی اپنے بوائے نہ بولا بہت نام لے لے کے ہم تو پکالے
 کسی خضر فرخندہ صورت نے ہم کو نہ زمیں بخشی نہ جادو سکھایا
 بیس تو زمانے کے کوہِ ندا سے یہی ایک پیغام سننے میں آیا
 ”نہ سینے سے آہوں کے بادل اٹھاؤ، نہ آنکھوں سے اشکوں کے خوشے گاؤ
 جو محنت کرو اس کی اجرت بھی مانگو جو کھیتی کو جوتا ہے روٹی بھی کھاؤ“

مگر آنے والے زمانے کے مرلے جو آئے تو با صد کرامات آئے
 پرانے صحیفوں کے احکام عشرہ کو منسوخ کر کے نئے حکم لائے
 کتابوں کے پیچیدہ لفظوں کا جادو بھی ہر ق کے بیٹوں کے سر پرچے لہا
 نئے ہادیوں نے نئے منبروں سے نئے آدمی پر نیا بھید کھولا
 ”سہ طاق“ چرخ چہارم کے اوپر دبیر ازل کے نوشتے دھڑے ہیں
 کہ جن میں بشر کے مقدر کے اعراب اوقاف تک مرتسم ہو چکے ہیں

سہ کنگ آ رہے کے دربار کا جادو گرجس کا کردار ولن کا کردار ہے۔

جو چھوٹا ہے تحقیق چھوٹا ہے گار۔ بڑے ہی کے مقصوم میں ہے بڑائی
یہ کا وہ ہے باغی ابو ذر فساد ہی یہ مزدک ہے کافر یہ سین قتائی

۳

اُجالے کے مناد سورج کی رفتار تاروں سے یا کہکشاں سے چھپی ہے
تو پھر کج کی شام کیوں آنے والے سوئے کے عدو کو بھولی ہوئی ہے
اُجالے اندھے کے طنز تاگے طلسمات کیا کیا بنے جا رہے ہیں
نئے بندی خانوں کی باڑوں کے کانٹوں میں وحشی خیالوں کو ابھاریں
یونہی شب کے پہلے پہر کے مسافر ہر گام تازہ غزل گانے والے !
سلاسل کے بوجھ کی نیگیں صلابت کو شبتاں پہ پگھلانے والے !
زمانے نے گیشی غلاموں سے اب تک ہزاروں برس فاصلہ طے کیا ہے
ہر اک گام پر یہ مسافر تے دیکھا کوئی بیٹل راہ رو کے کھڑا ہے

زمین زادگاں پر زمیں زادگاں نے کبھی تیر چھوڑا کبھی دم پھینکا
کبھی شہر و قریہ کو بلین بنایا، کبھی کشت و گلشن پہ نیپام پھینکا

۱۷ BASTILLE & GALLEY SLAVES فرانس کا مشہور قید خانہ جو انقلاب فرانس میں بنا

۱۸ نازیوں کا مشہور بندی کیمپ

کبھی اپنے طرارِ میاں دیکھیے، کبھی اپنی حسّہ رازِ فوجیں بڑھائیں
 کبھی ٹینک در ٹینک چڑھ آئے ظالم مگر ایسے حق بات رکتی ہے سائیں؟
 کسی نے کہا اب اُرن چھتریوں سے قلم کے جیالے سپاہی مارو
 چلو چل کے مطلب کے میدان دیکھو، چلو کچے ذہنوں پہ ششخون مارو
 فسانے بنویہ تیا آدمی غاصبوں کے ہے کھل کھیلنے کا بہانا
 کسی نے بہائم کے بارٹھے کا باسی کسی نے خداوندِ ناما کا مٹ جانا

نیا آدمی بوڑھے آدم کا بٹیا کہاں تک بھلا خود کو حیران کرتا
 سرِ بامِ چرخِ چپارم بھی پہنچا سرِ بالِ حبیریل طیران کرتا
 اسیرِ ازل نے دبیرِ ازل کے نوشتوں کی محفوظ تحریریں بدلی
 یہ بے باک و گستاخ و کافر تو ٹھہرا مگر ارضِ اسفل کی تقدیر بدلی
 کبھی ہوانگ سموکے خروشِاں بہاؤ کے تسخیر کرنے کو پستے بنائے
 کبھی آمو دریا کی پہنائی چیرے تو دشتوں کو فصلوں کے ٹردے بنائے
 بلوں کی مشینوں کے جائے یہ مزدور، دھرتی کے کھیتوں کے بیٹے یہ ہالی
 ہونے تاشقند و بخارا کے سلطان بنے کینٹن اور مکڈن کے والی

عہ جارج آروں کی "اینی مل فارم" شہ کراسمین کی مرتبہ "مگادویش فیلڈ"

ہمیں بھی ہوس تھی کہ آدرش کے محل ایسے بنائیں کہ ڈھائے نہ جائیں
 سرِ عشق میں بے ستوں کوئی کاٹیں جنوں کو کسی سجد میں آزمائیں
 کسی بحر میں لے کے نکلیں سیفینہ تو پہنائے پاتاں تک گھوم آئیں
 وہ بیسروں کی دادی وہ مونگوں کے ٹاپو کہاں ہیں چلو ہمیں آزمائیں
 جو کنگال ہیں ان کو دھرتی کی دولت عنایت کریں مندوں پر بٹھائیں
 جو فردِ دُور ہیں ان کو محنت کا حاصل جو دہقان ہیں ان کو کھیتی دلائیں
 جو ناکام ہوں تو غر۔ لخواں غر۔ لخواں بڑھیں بہرِ پاداش بے خوف ہو کر
 مریں تو مریں مثلِ گبرِ ملی پیرِ می، جیسے تو جہاں میں دمرتوٹ ہو کر

مگر دوستو دوستو دوستو! ہم جہاں سے چلے تھے ابھی تک وہیں ہیں
 وہ آدرش کے محل تو ڈھا چکے ان کے کھنڈرات میں غفل بن کے کیس ہیں
 وہ پہلے سا وحشت کا عالم کہاں ہے ابھی سے یہ محسوس ہونے لگا ہے
 افق سے افق تک بڑی منزلیں ہیں کراں سے کراں تک بڑا فاصلہ ہے

لے فرانس کا ایک انقلابی جوانا زلیں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ سٹہ مقدمہ آتش ریشاں کا بیرو

بہت جی میں آتی ہے یار دس کھدیں ہمیں بھی پکارو ہمیں بھی بلاؤ
مگر کالے کوسوں کی دشوار منزل کچے جا رہی ہے ابھی لوٹ جاؤ
گداٹی میں ہم شہر کنعاں کے سینوں کے محلوں کے دیوار و درجہ جمائے
جو سچ پوچھو اس میں بڑی عافیت ہے مگر قلعہ مصر کو کون ڈھائے؟

ہمیں گود بن کر پس کارواں دھندلے دھندلے سے قدموں پہ جتے رہیں گے
ہمیں راستے کے ہر اک موڑ پر اک نہ اک عذر پر یو نہی تھتے رہیں گے
مگر دور کی منزلوں کی یہ راہیں تو ویران اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی
جرمی شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے انجان اب تک ہوئی ہیں ہوں گی
سمجھتے ہیں ہم آنے والا زمانہ تمہارا ہے لوگو ہمارا نہیں ہے
مگر اپنے پاؤں کو تھکے گئے۔ ان میں اوداگے بڑھنے کا یارا نہیں ہے
یہی راستہ ہے رُکے تو گئے۔ رات لمبی ہو یا باٹ لمبی ہو جاؤ
وہ پورب میں میاں بھڑوں کے گلے کے باڑے کے پہلو میں ہکا الاڈ

کو بے پرک چھوٹا سا پتھر ملا خبر یہ ہے جنوٹی کوریا
 کے ساحل پر جہاں امریکیوں نے شہائی کوریا کے بھی قید یوں کو
 رکھا تھا، ان میں بہت سے دست و پا بریدہ تھے۔ کیمپ کے
 حالات ناگفتہ بہ تھے۔ قیدیوں کو ان کی حکومت کے خلاف مرنے
 جاتا تھا۔ بھوکا رکھا جاتا تھا اور ان کے جسموں پر زبردستی کمبوزم
 کے خلاف نعرے گودے جاتے تھے۔ آخر ان لوگوں نے
 بالسنوں پتھر دیں اور میا کھیوں کے بل پر بغاوت کر دی جس کا احوال
 مغربی اخباروں رسالوں میں پھیپا۔ یہ نظم و دنوں سویرا اور شاہراہ
 میں پھپی ہتی لیکن چاند جگر کے پہلے ایڈیشنوں میں شامل نہ کی جا
 سکی تھی۔ یہ نظم اور ایک دوسری نظم ”کوریا کی خبریں“ کیونکہ اس
 زمانے کی ہماری حکومت کو اس قسم کا کلام گوارا نہ تھا۔
 دریائے یالو کے پستوں پر حملہ جہاں کوریا کو بجلی پہنچانے
 والے ہیڈرکس تھے اور قریہ سنچو کی تباہی بلکہ ناپیدی کوریا
 کی جنگ کے ان واقعات میں سے تھی جس نے ضمیر عالم کو جھنجھوڑ کر
 رکھ دیا تھا۔ نیکی نرسوں کے جلوس نکالنے کی تصویریں بھی دنیا بھر
 کے اخباروں میں چھپی تھیں۔

کوہے کی لڑائی

پھر کوہے میں گولی برسی، پھر کوہے میں جنگ ہوئی

پھر سرخوں نے سازش کر کے ہنٹا کا پرچار کیا
 گود میں آزادی کی ٹہمک کر اس نے سے انکار کیا
 اپنے باغی راگ الاپے، سرخ سرخ جھنڈے لہائے
 سارے بندی ایک کر کے نکلے اور لڑ کر چلے گئے
 مہم کو ہمارے حال پہ چھوڑو! اجنبیو اس دیس سے جاؤ
 نگر نگر کو بندی خانہ، کھیت کھیت مرگھٹ نہ بناؤ
 ان کی باغی للکاروں سے وادی وادی گونج اٹھی!
 پھر کوہے میں گولی برسی، پھر کوہے میں جنگ ہوئی

سے ہنٹا، تشدد

ہم نے انہیں کتنا سمجھایا روس کی چالیں ہیں کیا کیا
 ہم لوگوں کو سات سمندر پار سے کیونکر آنا پڑا !
 پر وہ ہماری انسانی ہمدردی کے قائل نہ ہوئے
 جبری مزدوری سے بچ کر آنے پر مائل نہ ہوئے
 آخر ہم ٹینکوں کے دستے، طیاروں کے بیڑے لائے
 بمباری توپوں سے دنا دن گولے پھینکے، بم برسائے
 سو دو سو وہیں ایک بارڈھ میں ڈھیر ہوئے، کروٹ بھی نہ لی
 جب کبے میں گولی برسی، جب کبے میں جنگ ہوئی

اس پر بھی سُرخوں کے ارادے باغی کے باغی ہی رہے
 بلکہ اب تو سُرخ پھر یے اور بھی اپنے اڑنے لگے
 باغیوں کے گیتوں کی تانیں شعلے سے برسنے لگے
 شام و سحر اس کیمپ سے باہر گرم ہوائیں آنے لگیں
 ان لوگوں کو گالی مہر کی کھانا تک منظور نہ تھا
 اپنے جسموں پر نعرے گدوانا تک منظور نہ تھا
 خون ہمارا پھر کھول اٹھا۔ پھر سوئی غیت سر جاگی !
 پھر کبے میں گولی برسی، پھر کبے میں جنگ ہوئی

کہیں پتھر، کہیں بانس کی لالھی، کہیں چاقو تھا کہیں بھالا
 ان لوگوں کے پاس لڑائی کا کیا کیا سامان نہ تھا
 اسی عالم میں حملہ کرنے پلٹن کی پلٹن اڑی
 امریکی جانوں کی ان کو ذرہ بھر پروا نہ ہوئی
 ہم تنہا — اور پاس ہمارے یہی ٹینک یہی طیارے
 اس پر بھی ہم لوگ نہ کچھ گھبرائے نہ کچھ ہمت ہارے
 ایک طرف تھے کیمپ کے باسی، ایک طرف ہم پردہسی
 جب کوجے میں گولی برسی، جب کوجے میں جنگ ہوئی

کہنے کو اس کیمپ میں چھ سو لنگڑے اور اپنا بچ تھے
 لڑنے میں پہلی لوگ تھے دوسروں سے آگے آگے
 گھٹنوں اور ہاتھوں پر اُچکتے بڑھتے تھے ظالم وحشی
 ایک ایک کے ہاتھ میں تھتی لکڑی کی جسیابک میا کھی
 ہم لوگوں کے پاس توجہ مہتیار تھے، ہم نے کدھی دیا
 اس پر بھی اس جنگ میں ہم لوگوں ہی کا پتہ بھکا رہا
 اسی نئے دہی مرے اور ایک ہزار امریکی
 جب کوجے میں گولی برسی، جب کوجے میں جنگ ہوئی

امن کا ساتھ ہمیشہ دیا ہے امن کا ساتھ سدا دیں گے
 چاہے ہمیں اس امن کی خاطر تیسری جنگ بھی لڑنی پڑے
 امن کی اور کسے خواہش ہے آزادی کی کس کو طلب
 ایٹم بم، نیپام کے گولے جو مانگو تیار ہے سب
 پہنچے گا ابھی ان کی بدولت دور دور تک امن کا نام
 کو دیا میں لڑنے والے امریکی جانبازوں کو سلام
 تاریخوں میں نام رہے گا دنیا کبھی نہ جھوٹے گی !
 کیوں کو جے میں گولی برسی، کیوں کو جے میں جنگ ہوئی



کوریہ کی خبریں

آج امریکہ کے بیماروں نے بیماری کی
بند یا تو کاتبہ کر کے بالآخر چھوڑا
نیم شب گئے اڈیٹر کو جہاں آئی !
ایک کالم میں کہیں اس کو بھی اس نے جوڑا
عمید مسعود کے پیغاموں کے تھوڑے نیچے
اور اسی شام کو اخبار وہ باسی بھی ہوا

اور یا تو کے بڑے بند کی بجلی گاہیں !
ایک مھلے سے خرابے کے سوا کچھ نہ رہیں
کھڑا تہ ہوتی یکبارگی پسکیں موبیں
آہن دنگ کی دیواریں جو تیرا کے گریں
اور اس رات کہیں نور نہ تقسیم ہوا
کارخانوں کی وہ ریزاد مشینیں نہ چلیں

اتنے برسوں نے انسان نے پتھر ڈھوئے
 تب کہیں ساحلِ یلو کا یہ پُشتہ اُبھرا
 دُور کی رُل کے مچلتے ہوئے پہیے گھومے
 دُور کے شہر کی شہراہ کا چہرہ چمکا
 اور امریکہ کے بیابانوں کی اک ٹکڑی نے
 ایک ساعت میں اسے نیست و نابود کیا

اپنے اس ملک سے وہ پیلا ہے ہم کو کہ ادھر
 دوسرے ملک کا کوا بھی نہ آنے پائے
 اور اک دیں میں جب وحشی مہنوں کے لشکر
 موت کے تحفے غلامی کے سدیے لائے
 ہم نے ان لوگوں کی نصرت کی دعائیں مانگیں
 ہم نے اُن لوگوں کی عظمت کے قصیدے گائے

یاں نہ شعلوں کی تپک اور نہ توپوں کی شک
 یا تو دریا ہے بہت دُور بہت دور کہیں
 پھر بھی اک بات ہے انسان سے حیوان ملک
 جس کا اس حال مشکل ہی سے آئے گا یقین
 اب کہ یاتر کے بڑے بند کی عیبلی گاہیں،
 ایک جھلسے سے خرابے کے سوا کچھ بھی نہیں

کو ریا میں بے لڑائی کی نئی سالگرہ

آج اس جنگ کے آغاز کو دو سال ہوئے
 پڑھنے والے نے کنکھیں ہی سے اس کو دیکھا
 اور اخبار کے دوچار الٹ کر منہ
 اب کے شہزادہ علی کس سے کریں گے شادی
 ایک مسمن کو پڑھنے لگا بے تابی سے

جیسے یہ سالگرہ عیدِ عزیزاں ہی تو ہو
 جیسے کچھ دیر میں لائے ہوں کھیلے مہاں
 ایک ننھے سے حسیں چاند کی دل جوئی کو
 نہکت درنگ و لطافت میں بے عنوان گراں
 شرِ تبریک میں تحفوں کے کھلیں گے دھاگے
 اور ہر شے پہ پھل جائے گا وہ جانِ جہاں

اور یہ جشن یہی سالگرہ دُور کہیں
 ایک وادی میں سے گزری ہے جو چپکے چپکے
 کوئی صحرا کا چھلدا کسی لاشے کے قریں
 کس کے ہونٹوں کی تلاء کیجئے پُرانے رقصے
 ایک لمحے کو سنتے ہوئے رک جاتا ہے
 اور کہتا ہے کہ اس بات کو دو سال ہوئے

دور کے دیس سے آتے ہیں سچیلے مہاں
 کوریا کے لئے تحفے میں کھلونے لے کر
 یہ میں مہربان یہ نیلا سلہے یو این کاشاں
 یہ مہمے ٹینک یہ تو ہیں یہ حبیبے لشکر
 یہ رہی موت یہ ویرانی یہ بندی حائل
 تجھ سے کیا چیز ہے اے جانِ برادر بہتر

دشتِ ویراں میں کسی غولِ سیاہاں کی طرح
 ستارے کوریا والوں کے بھٹکتے نکلے
 کون منزل ہے کہاں پہنچیں گے بھٹکے راہی
 آپ کٹ جائیں گے اس راہ کے کٹتے کٹتے
 درد کی رات ہے لمبی شبِ ہجران کی طرح
 جس میں مہتاب کی مشعل ہے نہ تاروں کے دیے

۳

سطحِ کاغذ پر سیاہی نے چنی ہے افشاں
 ملگے ملگے صفحوں پر یہ ہے جاں کسی سطور
 کتنی گودوں کے اُجڑنے کا بے بی عنوان
 کتنی مانگوں سے دھلائی ہیں سیلا سینہ در
 کتنے کھیتوں میں اُگاتی ہیں پُر آشوبِ صحران
 کتنے میدانوں میں قبروں کی قطاریں بھر پور

ریڈیر شام کلاتا ہے شیا شبِ خمبر میں
 ہر نئی صبح چلا آتا ہے تازہ اخبار
 آج تو گاؤں سنجو کا بھی یاد آیا زد میں
 اب تو راک بھلا فراہ ہے وہ خستہ مسمار
 آج نیسپام نے بھلا دی ہے کشتِ مہقاں
 آج زندوں کے لئے کھوٹے میں زندوں نے مزار

بکثیر برقی ہیں بھرے کیفوں میں ایوانوں میں
 کون اس جنگ میں مجرم ہے یہ کس کو معلوم
 کون سے ملک کی سرحد ہے کہاں کیا جانیں
 کوریا والے کہ امریکی ہیں اس میں مظلوم
 کیوں عبث جی کے جلنے کو تم اخبار پڑھو
 ایک ہم زندہ حقیقت ہیں، یہ باقی مہموم

زخمی بچوں کی کراسوں میں ترنم ہے نہ لوج
 ننگی زسوں کی نگاہوں میں نہ دس ہے نہ مٹھاس
 جھکے کھیتوں کے نظارے سے تو پھلتی نہیں سورج
 سونے شہروں نے تو پہنا ہے اداسی کا لباس
 پھر وہ کچھ لوگ سببانے چلے ایرانِ غزل
 کوئی مضمون ہی نہیں شاعر مجبور کے پاس

آج یا تو ہے توکل اور بھی پُشتہ کوئی
 اب سننم ہے توکل اور بھی قریے ہونگے
 آج پررب کے فراہوں میں ہے اترا کوئی
 کل یہ کرگس سبھی اطراف میں پھیلے ہوں گے
 آج کے روز جو یہ بات نہ سمجھتا کوئی
 آنے والے ہیں جو ایام وہ کیسے ہوں گے؟

(۱۹۵۲ء)

ختم شد

انشاء نے پھر عشق کیا

خطاب کسی دوست کا لوگوں سے:



ہم نے کہا نہ تھا کہ وہ کیا کیا نہ کریں گے
ہاں صبر کی کہتے ہو تو انشاء نہ کریں گے
بڑھ جائے گا آزارِ محبت ہے یہ لوگو
وہ ایک نظر دیکھ کے اچھا نہ کریں گے
اُن سے یہ کہو ایسے دوانوں سے نہ الجھیں
سُن لیں گے مگر آپ کا کہنا نہ کریں گے
سائل ہیں فقط ایک عنایت کی نظر کے
یہ اور کسی شے کا تقاضا نہ کریں گے
در سے نہ اٹھائیں وہ ضمانت پہ ہماری
رُسوا ہیں مگر آپ کو رُسوا نہ کریں گے



AAKIF BOOK DEPOT

3243, Kucha Tara Chand, Darya Ganj, New Delhi-2

www.aakif.com

email : aakif@del3.vsnl.net.in

Ph.: 23257189 Fax : 011-23265480

ISBN 818188063-3



9 788181 880635

Rs. 120/-